آسمان کے باشندے



ابراہیم جلیس

آسمان کے باشندے

بڑے اور چھوٹے آدمیوں کی زندگی
کی کتاب کے آخری اوراق

مصنف
ابراہیم جلیس

پاک کتاب گھر
۳۵۔ اردو بازار۔ کراچی ۱

آسمان کے باشندے

قیمت ۱۲ روپے

بار اوّل ــــــــــ فروری ۱۹۷۳ء
تعداد ــــــــــ ۱۱۰۰
ناشر ــــــــــ پاک کتاب گھر
پریس ــــــــــ

فہرست مضامین

سیاسی شخصیات

ادبی و صحافتی شخصیات

مرگ انبوہ

گمنام شہید

حرفِ چند

ادبی ذوق رکھنے والے تمام پاکستانی پاک کتاب گھر
ڈھاکہ کے نہ صرف نام سے واقف ہوں گے بلکہ اُردو کی ترقی
کے لئے پاک کتاب گھر نے پاکستان کے اس حصّے میں رہ کر جو
خدمات انجام دی ہیں وہ بھی جانتے ہوں گے۔ بنگالی بولنے اور پڑھنے
والوں کی اکثریت میں رہ کر اُردو کا کام کرنا، اُردو کی کتابیں چھاپنا۔
صرف کاروبار ہی نہ تھا بلکہ اُردو سے لگاؤ اور محبت تھی۔ اور یہی محبت
مجھے زندہ اسلامت پاکستان کے اس حصّے میں لے آئی۔

پاکستان کے اس حصّے میں رہ کر جن ادیب دوستوں سے

آسانی سے ملاقات نہ تھی یہاں آ کر ان سے ملاقات بھی ہوئی اور
اِن کا تعاون بھی، کاغذ کی کمیابی اور نایابی کے دور میں جب بڑے
بڑے پبلشر ادبی کتابوں کی اشاعت تقریباً بند کر چکے ہیں، میرا
زبان کی خدمت کا جذبہ اور ذوق مجھے پھر مجبور کر رہا ہے۔ اور میں
اس جذبے کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر ادبی کتابوں کی اشاعت کا
آغاز کر رہا ہوں، اس سلسلے کی پہلی کتاب ملک کے مشہور ادیب
ابراہیم جلیس کے مضامین کا مجموعہ "آسمان کے باشندے" سے ہے۔

آسمان کے باشندے کے مضامین ابراہیم جلیس کے صرف
مضامین ہی نہیں بلکہ اُن کے دل اور جذبات کا آئینہ ہے جو ہر پڑھنے
والے کے دل پر اثر کرے گا۔

اس کتاب کے ساتھ ہی ابراہیم جلیس کے مزاحیہ اور طنزیہ
مضامین کا مجموعہ "پتے کی بات" بھی پیشِ خدمت ہے۔ دو کتابیں
جس اہتمام اور سلیقے سے پیش کر رہا ہوں اس سلسلے میں کچھ کہنے کی
ضرورت نہیں۔ کتاب ہاتھ میں آتے ہی سب کچھ بتا دیتی ہے۔

نجم الحسن



سلطان ٹیپو

آج میں کراچی سے سینکڑوں میل دور ہندوستان کے جنوب میں آباد شہر سرنگاپٹم کی آغوش میں پھولوں سے مہکتی قبر کو دیکھ رہا ہوں۔

یہ قبر۔ پاکستان اور ہندوستان کے ایوانِ آزادی کا پہلا پتھر یا سنگِ بنیاد ہے۔

یہ قبر ارضِ ہمالہ کے ۷۰ کروڑ باشندوں کے اوّلین محسنِ اعظم کی آخری آرام گاہ ہے
وہ محسنِ اعظم ہے سلطان فتح علی خاں ٹیپو شہید رحہ۔

وہ عظیم محسن ٹیپو جس نے آج سے ٹھیک ایک سو اُنہتر سال پہلے ارضِ ہمالہ کے باشندوں کی آزادی کو اپنے لہو سے حیاتِ جاوداں کا پہلا جام پلایا تھا۔

جب کبھی میں تصور کی آنکھوں سے شیر دل شہید ٹیپو کی گُل پیرہن تربت دیکھتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ ہر ایک سے کہوں۔

"ٹیپو کی طرح جیؤ۔ ٹیپو کی طرح امر ہو جاؤ۔"

جینے کے ساتھ مرنا وابستہ ہے۔ چنانچہ مجھے کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ "ٹیپو کی طرح جیؤ اور ٹیپو کی طرح مرو"۔

لیکن ٹیپو مرا ہی نہیں تو میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ۔ ٹیپو کی طرح مرو۔

حق کا سپاہی پیدا ہوتا ہے لیکن مرتا کبھی نہیں۔ البتہ اس کے دنیا سے چلے جانے کو "مرنے" کے بجائے "امر ہو جانا" کہا جاتا ہے۔

ٹیپو نے تو کہا تھا:۔

"گیدڑ کی طرح سو سال تک جینے سے شیر کی طرح
ایک دن جینا بہتر ہے۔"

لیکن ٹیپو کو کیا پتہ کہ "شیر" کی طرح ایک دن جینے کے بجائے وہ "شہید" کی طرح ابدالآباد تک کے لئے جی رہا ہے!

اس دنیا میں حق کے لئے سرفروش ٹیپو سے بھی بہت بڑی بڑی شخصیتیں گزری ہیں، لیکن میں ارضِ ہمالہ کا بیٹا ہوں، اور میں ارضِ ہمالہ کے سرفروشوں میں سب سے بلند درجہ ٹیپو کو دیتا ہوں۔ اس لئے کہ ہندوستان پر غیر ملکی غلامی کے گھٹاٹوپ

اندھیرے میں آزادی کی جو پہلی بجلی کوندی وہ ٹیپو ہی کی لپکتی چمکتی شمشیر برہنہ تھی۔

ارض ہمالہ پر سے انگریز کی غلامی کے اندھیرے کو بھگانے کے لئے اور آزادی کے پہلے چراغ کو جلانے کے لئے سب سے پہلے جس نے اپنے لہو کا تیل دیا وہ جیالا ٹیپو ہی تھا۔

غلامی کے اندھیرے میں ٹیپو کے لہو سے آزادی کا جو پہلا چراغ جلا تھا اس چراغ کو بہت مدہم ہی لیکن چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ اور سرنگاپٹم کی جنگ آزادی سے لے کر ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادیٔ پاکستان تک لہو کے چراغ پھر اتنے جلے، اتنے جلے کہ بالآخر آزادی کا "چراغاں" ہو گیا۔

یہ لاکھوں آفتابوں اور کروڑوں ماہتابوں کے اُجالے سے بھی زیادہ روشن اور زیادہ جگ مگ اُجالا اب سے ایک سو نہتر سال پہلے ٹیپو ہی کی مختصر زندگی کے ننھے چراغ ہی سے پھوٹا تھا۔

ٹیپو نے قسم کھائی تھی۔

"جب تک میں انگریزوں کو اپنے ملک سے نہ نکال دوں گا۔ نہ تو پلنگ پر سوؤں گا اور نہ قیمتی لباس پہنوں گا"۔

مرد ٹیپو نے اپنا عہد پورا کر دکھایا۔

اس کی زندگی تو انگریزوں کو ہندوستان سے نہ نکال سکی لیکن اس کی

موت نے ضرور انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا۔

مرد ٹیپو نے اپنا قول نبھایا۔ اس نے قیمتی لباس نہیں پہنا۔ اس نے کفن پہنا۔ وہ زمین پر سوتا رہا حتیٰ کہ زمین میں سو گیا۔

"ٹیپو اگر نہ مرتا تو ہندوستان کبھی نہ زندہ ہوتا۔"

ٹیپو نے ارضِ ہمالہ کے غلاموں کو آزاد زندہ رہنے کے لئے مرنا سکھا دیا۔

ٹیپو کی زندگی تو بہت چھوٹی تھی لیکن اس کی موت بہت بڑی تھی۔

ٹیپو کی زندگی کیا تھی — ! ریاست میسور کے والی حیدر علی کے کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس نے ایک برگزیدہ بزرگ "ٹیپو مستان علی" کے آستانۂ عالیہ پر اولاد کی منت مانگی جو قبول ہو گئی اور ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ کو ارضِ ہمالہ کی غلامی کا دشمن آفتاب۔ "فتح علی خاں" کے نام سے دُنیا میں آیا اور "ٹیپو" کے لقب سے مشہور اور تلواروں کی جھنکاروں اور توپوں کی گھن گرج میں بچے سے جوان ہوا۔

اپنے باپ کے انتقال پر ۲۰ محرم، ۱۱۹۷ھ کو تخت نشین ہوا۔ ٹیپو بھی ایک بادشاہ تھا۔ اس زمانے میں بادشاہ مطلق العنان ہوتے تھے۔ عوامی حکومت اور جمہوریت کسے کہتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن ٹیپو اس زمانے کے لحاظ سے "عجب بادشاہ" تھا۔ کیونکہ اس نے اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد اپنی رعایا کو اس طرح مخاطب کیا۔

"میں عام لوگوں کی طرح ایک عام انسان ہوں۔ مجھ میں اور ایک شہری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں اور میری حکومت ہمیشہ

رہنے والی نہیں ہے میرے لئے بھی فنا ہے اور میری حکومت
کے لئے بھی۔ میں اپنی زندگی کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس پر
بھروسہ کرسکوں، پھر بھی میرا یہ فرض ہے کہ وطن کی آزادی کے لئے
لڑتا رہوں اور اسی دُھن میں اپنی جان دیدوں میرے ارادے بلند
اور پختہ ہیں دُنیا کی کوئی طاقت انھیں کم نہیں کرسکتی۔ اگر میں وطن
کی آزادی کے لئے لڑتا ہوا مارا بھی جاؤں تو اس کی پرواہ نہیں
کروں گا۔ انسان آزادی کی جنگ کرتا ہوا مرسکتا ہے۔ اس کا خلوص
اور وطن کی محبت کا جذبہ کبھی نہیں مرسکتا۔"

ٹیپو کو انگریزوں نے شہید نہیں کیا بلکہ اس کی آستین ہی کے سانپوں
قمرالدین پورنیا اور میر صادق نے اسے ڈس لیا۔

ارضِ ہمالہ کے حریت پسندوں کے دشمن انگریز اتنے نہیں تھے
جتنے کہ ارضِ ہمالہ کے بعض نمک حرام ناخلف بیٹے۔!

ہندوستان کی تاریخ میں غیر ملکی غلامی کے دروازے جب بھی کُھلے ہیں
ارضِ ہمالہ کے بعض نمک حرام اخلاف ہی کے ہاتھوں کُھلے ہیں یعنی۔

جعفر از بنگال صادق از دکن
ننگ ملت ننگ دین ننگ وطن

اب میں کراچی سے سینکڑوں میل دور تصور کی نظروں سے جنوبی ہندوستان

کی اُس سرزمین کو چُوم رہا ہوں۔

ع شکوہ کیقبادی سطوت جم دفن ہے جس میں
وطن کی خاک کا فرزند اعظم دفن ہے جس میں



سر سیّد احمد خاں

اب سے کوئی نوّے برس پہلے مسلمان ہند کے سب سے بڑے محسن سر سیّد احمد خاں نے ہندوستان کے اُس خطۂ زمین پر جو علیؓ کے متقدس نام پر علی گڈھ کہلاتا ہے ــ جب ایک مسلم درسگاہ کا سنگ بنیاد رکھا تو اس وقت سر سیّد احمد خاں کے خیال وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ دراصل دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کا سنگِ بنیاد رکھ رہے ہیں ــ اب جبکہ پاکستان ایک تاریخی حقیقت بن چکا ہے اور ہم راولپنڈی کے ایوان صدر سے علی گڑھ کی "کچی بارک" تک ہندوستان کے ماضی کی تاریخ میں نظریں دوڑتے ہیں تو اب پتہ چلتا ہے کہ :ـ

پاکستان کا پہلا پتھر تو علی گڑھ میں رکھا گیا تھا۔ ہندوستان میں "مسلم اقتدار" کا پہلا تصور شعوری یا غیر شعوری طور سب سے پہلے سرسید احمد خاں نے پیش کیا۔

پھر اس تصور کو علامہ اقبالؒ نے "پاکستان" کا نام دیا۔

اور پھر پاکستان کے نام کو قائداعظم محمد علی جناح نے "دنیا کی تاریخ" اور "زمین کے نقشے" پر قیامت تک کیلئے لکھ دیا۔

اگرچہ پاکستان کی تعمیر کے لئے ارضِ ہمالہ کے ہر مسلمان نے ایک اینٹ رکھی ہے تاہم پاکستان کی تعمیر کا "ہراول دستہ" علی گڑھ یونیورسٹی کے ہوسٹلوں کے دروازوں ہی سے باہر نکلا تھا۔

پاکستان کی تعمیر میں علی گڑھ کا طالب علم جہاں سب سے آگے تھا۔ اب پاکستان پر حکومت کرنے میں بھی سب سے آگے علی گڑھ ہی کا طالب علم ہے۔

یہاں میری مُراد علی گڑھ کے "ڈیڑا ولڈ لواتے" محمد ایوب خاں صدر مملکت پاکستان سے ہے۔

ہندوستان کی سیاسی بیداری میں سرسید کے "معنوی بیٹے" ہر شعبۂ زندگی میں سب سے آگے رہے ہیں۔ صدر پاکستان محمد ایوب خاں کے علاوہ ہندوستان کے نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین بھی علی گڑھ ہی کے نامور فرزند ہیں۔

ہندی مسلمانوں کی تاریخ کے ایوان میں جتنے بھی چراغ فروزاں ہیں یعنی مولانا

محمد علی، خواجہ ناظم الدین، بابائے اُردو مولوی عبدالحق، پروفیسر احمد رشید، احمد صدیقی سے راقم الحروف وغیرہ وغیرہ تک ان سارے چراغوں کو "اجالے کا تاج" علی گڑھ یونیورسٹی ہی نے پہنایا ہے۔

سرسیّد علیہ الرحمتہ صرف ہندی مسلمانوں کے مُحسنِ اعظم ہی نہیں تھے بلکہ وہ بانیٔ پاکستان بھی تھے۔

ہر اچھا آدمی بڑا آدمی ہوتا ہے اور ہر بڑا آدمی زندہ دل ہوتا ہے۔ چنانچہ سرسیّد بھی بڑے زندہ دل آدمی تھے۔

سرسیّد علیہ رحمتہ نے جس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا چراغ علی گڑھ درسگاہ کے نام سے جلایا اس وقت سرسیّد ہی کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کی مخالفت کی ایسی تیز آندھیاں چل رہی تھیں کہ ہر لمحہ یہ ڈر ہوتا تھا کہ یہ چراغ اب بُجھا کہ اب بُجھا۔

سرسیّد کے ہم وطن اور ہم مذہب انہیں کافر، ملحد، لامذہب، دجال اور کرسٹان وغیرہ کہتے تھے اور دل ہی دل میں یہ بھی کہتے تھے کہ

"ہے تو کرسٹان۔ مگر قوم کی بھلائی اگر ہوگی تو اسی کرسٹان سے ہوگی"

بابائے اُردو مولوی عبدالحق فرماتے تھے کہ زندہ دلی ان کی فطرت تھی۔ وہ اپنی مخالفت سے بڑے خوش ہوتے تھے اور جب کسی دن ان کی کہیں سے کوئی مخالفت نہ ہوتی تھی تو وہ پریشان ہو کر کہتے :-

"ہمارا حال اس بُڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کہ کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے۔؟" (تہذیب الاخلاق)

سرسید ہمیشہ یہ کہتے کہ :۔

"وہ آدمی ہی کیا جس نے کچھ مخالف نہ پیدا کیے !"

سرسید کے سب سے بڑے مخالف ایک بزرگ مولوی علی بخش تھے جنہوں نے سرسید کے خلاف علمائے دین سے فتویٰ لانے کے لئے سفر حج کا قصد کیا تو سرسید نے فرمایا :۔

"مولوی علی بخش کو ہمارے کفر کی بدولت حج اکبر نصیب ہوا سُبحان اللہ ہمارا کُفر بھی کیا کُفر ہے کہ کسی کو حاجی کسی کو ناجی اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بنا دیتا ہے"

ایک مولوی صاحب نے ایک بار سرسید کو خط لکھا کہ میں معاش کی طرف سے بہت تنگ ہوں، عربی جانتا ہوں، کسی ریاست میں میری ملازمت کے لئے سفارش کر دیجئے۔ سرسید نے جواب لکھا :۔

"آپ میری "تفسیر قرآن" کا رد لکھ کر چھپوائیں۔ کتاب خوب بکے گی اور آپ کی تنگی دُور ہو جائے گی"

ایک بار سرسید حیدر آباد دکن تشریف لے گئے تو ایک صاحب نے پوچھا :۔

"لوگ آپ کو "رسول" کہتے ہیں آپ کے پاس ان کی نشانی کیا ہے؟"

سرسیّد نے داڑھی اُٹھا کر "رسول" ہونے کی نشانی کے طور پر اپنی "رسولی" دکھادی۔

سرسید جہاں انگریز علوم کے دلدادہ تھے، وہاں انگریزی حکومت کے جانی دُشمن تھے چنانچہ ایک بار انہوں نے فرمایا:-

"ہمیں گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر ہم میں سیلف ریسپکیٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائے پر نہیں ہے۔"

۲۴ اکتوبر ۱۹۶۴ء



نواب بہادر یار جنگؒ

میں ہر اُس انسان کے نام پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتا ہوں جو انسان دُنیا کی زمین کو انسان کی غلامی کی پرچھائیں سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے لہو سے چراغ جلاتا ہے۔

میں ہر اُس انسان کو مسرت اور عزت کی نظروں سے دیکھتا ہوں جو انسان کی آزادی کے لئے اپنے لہو سے سرحدیں کھینچتا ہے۔ خواہ وہ شخص شاہ سراج الدولہ ہو یا سلطان ٹیپو۔ خواہ کوئی غریب گمنام شخص جو ۱۹۴۷ء کے سنگِ میل کے آس پاس پاکستان اور ہندوستان کی کسی سرحد پر شہید ہوا ہو۔

لیکن اِس وقت تو میرے ہاتھ میں عقیدت کے پھول دوسرے ٹیپو نواب بہادر یار جنگ کے لئے ہیں۔ جن کی آواز کے شعلوں نے جہاں غیر ملکی غلامی

کی زنجیریں پگھلا دیں۔ وہاں انہی شعلوں نے پاکستان جانے والے راستے کو بھی فروزاں کر دیا تھا۔

پہلے پہل تو اس آواز کی گھن گرج صرف کوہستان بندھیاچل کی وادیوں میں گونجتی رہی لیکن جیسے جیسے یہ آواز جوان ہوتی گئی۔ اس کا جادو بھی سر چڑھتا گیا اور پھر تو ایورسٹ اور ہندوکش کی چوٹیاں بھی لرزنے لگیں۔ خلیج بنگال اور بحیرہ عرب تک میں اس کی آواز نے تموج پیدا کر دیا تھا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی سرزمین پر ٹیپو کا لہو نہ گرتا۔ سرسید نے درسگاہ علی گڑھ کی بنیاد نہ رکھی ہوتی۔ بی اماں نے محمد علی جوہر کو نہ جنم دیا ہوتا۔ اقبال نغمہ سرا نہ ہوتا۔ شیر بنگال مولوی اے کے فضل الحق کی چنگھاڑ سندرابن میں نہ گونجتی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی قیادت نہ سنبھالی ہوتی اور بہادر یار جنگ کی گرجدار آواز سرزمین ہمالیہ کو نہ جھنجوڑتی تو شاید پاکستان کبھی معرض وجود میں نہ آتا۔

لیکن یہ کیسے بے لوث اور بے نیاز محسن تھے۔ خود تو دو دو گز کی مختصر سی تربوں میں سمٹ گئے لیکن دس کروڑ مسلمانوں کے لئے اتنا بڑا اور ایسا عظیم الشان وطن لے کر دے دیا۔ اور خود اسے ایک نظر بھی نہ دیکھا۔ !

نواب بہادر یار جنگ کو بہ حیثیت ایک لاثانی مقرر اور ایک مثالی مرد مومن کے کون نہیں جانتا البتہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں حاضر

جوابی، شائستہ مزاج اور شستہ ظرافت جیسے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہ زاہد تو بلاشبہ تھے لیکن زاہد خشک ہرگز نہ تھے۔

پہلا واقعہ ان کی حاضر جوابی سے متعلق ہے۔

بہادر یار جنگ ۱۹۳۱ء میں بلادِ اسلامیہ کے سفر کے دوران قاہرہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ مصریوں کو ہندوستانی مسلمانوں سے یہ شکایت تھی کہ وہ کلام پاک کا ترجمہ کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ چنانچہ جامعہ الازہر کے پرنسپل صاحب نے بھی بڑے طنزیہ لہجے میں نواب صاحب سے کہا:۔

"آپ ہندوستانی مسلمان تو بڑے قابل اور عالم ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کا بھی ترجمہ کر لیتے ہیں۔"

نواب صاحب طنز کو فوراً بھانپ گئے لیکن بغیر برا مانے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا:۔

"قبلہ۔ توبہ توبہ۔ ہم خاکی انسانوں کی کیا مجال کہ کلام مجید کا ترجمہ کریں، ہم ترجمہ کی جسارت تو نہیں کرتے البتہ ترجمانی کی سعادت ضرور حاصل کرتے ہیں۔ اور ترجمانی میں یقیناً کوئی قباحت نہیں ہے۔"

بہادر یار جنگ کی انگریزی تعلیم صرف میٹرک تک تھی، لیکن جب میدان سیاست میں داخل ہوئے تو اس زبان کا سیکھنا بھی اس لئے لازم ہو گیا تھا کہ دشمن انگریزی کے سوائے اور کوئی زبان سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی انگریزی

زبان سیکھنے پر خاص توجہ دی اور تھوڑے ہی عرصے میں اس میں ایسی مہارت حاصل کر لی کہ ایک بار ایک جلسۂ عام میں بُلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے اُردو میں تقریر کی تو بہادر یار جنگ نے اعلان کیا۔

"اگر مسز سروجنی اُردو جیسی مشکل زبان میں تقریر کر سکتی ہیں تو بہادر خان انگریزی جیسی آسان زبان میں تقریر کیوں نہیں کر سکتا۔"

ایک واقعہ اور ہے۔ نواب صاحب ایران کے سفر پر روانہ ہوئے، تہران میں انہیں کسی مقام تک جانا تھا۔ انہوں نے سڑک پر ایک ٹیکسی کار روکی اور ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

"...... مقام تک کا کرایہ کیا لو گے۔؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

"آپ کتنے آدمی ہیں۔؟"

بہادر یار جنگ اکیلے تھے لیکن فرمایا۔

"دو۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے فی کس کرایہ بتایا تو نواب صاحب نے فرمایا:۔

"کرایہ تو ایک ہی کا دوں گا، لیکن چلیں گے ہم دونوں۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا:۔

"ایک آدمی کے کرائے میں دو کو نہیں لے جاؤں گا۔"

نواب صاحب نے فرمایا :۔

" میں اور میرا ساتھی ضرور جائیں گے اور میں کرایہ ایک ہی کا دوں گا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کو غصہ آگیا۔ اس نے انہیں لے جانے سے صاف انکار کر دیا تو نواب صاحب نے ہنس کر کہا۔

" بھیّا۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ کیا تم خدا کا بھی کرایہ لو گے۔ ؟"

بہادر یار جنگ کی شوخ طبعی نے ایک بار اپنی مدح آپ یوں کی تھی۔

آگاہ رموزِ دین فطرت ہوں میں
کچھ مجھ سے سنو لسان الامت ہوں میں
میں خطبہ سرا نہیں تو سونی ہے بزم
شاہنشہ اقلیم خطابت ہوں میں

بہادر یار جنگ کی شوخی گفتار، صدائے جگر گداخت اور لب معجز بیان کے ہزاروں قصیدے ہیں لیکن ان کے سوز نطق کے بارے میں میرے مرحوم دوست خواجہ معین الدین نے ایک ہی جملے میں جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ سارے قصیدوں پر بھاری ہے۔

" جب بہادر یار جنگ کی آواز فضا میں گونجتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بے عمل مسلمان پر قرآن اردو میں نازل ہو رہا ہو۔"



مولانا حسرت موہانی

ایک زمانہ تھا جب غریب آدمی بڑے آدمی نہیں ہوتے تھے۔ بڑے بڑے آدمی بڑے عالی شان محلوں سے نکلا کرتے تھے۔ لیکن پھر وہ دور بھی آگیا جب بڑے آدمی چھوٹے گھروں سے نکلنے لگے اور دُنیا بڑی حیرت اور مسرت سے دیکھنے لگی کہ

"بہت غریب آدمی بھی بہت بڑے انسان ہو سکتے ہیں"

مجھے اپنی زندگی میں جن تین بہت بڑے بہت غریب انسانوں نے متاثر کیا ہے وہ ولاڈی میر ایلیچ لینن، ماؤزے تنگ اور مولانا حسرت موہانی ہیں۔

لینن، ماؤزے تنگ اور حسرت موہانی ان تینوں کی زندگیوں میں بڑی مماثلت اور بڑی مشابہت ہے۔ یوں تو انسانیت کے ہر رہنما کی زندگی ہمیں

ایک سچّا اور اچھا انسان بنانے کے لئے یقیناً لائق تقلید ہے لیکن تقلید کے لئے جتنی آسان زندگی مولانا حسرت موہانی کی زندگی ہے۔ اتنی آسان زندگی کسی رہنما کی بھی نہیں ہے۔ مولانا حسرتؔ جیسا بڑا آدمی بننے کے لئے نہ تو عالیشان کوٹھی میں اقامت ضروری ہے اور نہ کار درکار ہے۔

دیسی کپڑے کی دو شیروانیاں، کھدر کے دو جوڑے قمیص پاجامہ، ایک ٹوپی، ایک جوتا، ایک بستر، ایمان کی روشنی سے جگ مگ دل، ناقابل فروخت ضمیر اور ہمیشہ سچ بولنے والی زبان — یہ حسرت موہانی کا نہایت مختصر اور نہایت مکمل تعارف ہے۔

مولانا حسرتؔ نے غریب انسان کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا وہ راستہ نیا نہیں ہے۔ اُن کا اپنا دریافت کردہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ غریب انسان کی عظمت کا یہ راستہ خدا کے سب سے زیادہ پیارے بندے حضرت محمد صلی اللہ و علیہ وسلم کے مقدس قدموں سے چھوتا تھا۔ پھر اس راستے کو چاروں خلفائے راشدین نے طوالت عطا کی اور میں نے اپنی زندگی میں اس راستے پر صرف مولانا حسرتؔ کے سوائے اور کسی انسان کو کبھی گام زن نہیں دیکھا۔

اِس راستے پر صدیوں پہلے حضرت عمرؓ اپنے اُس اونٹ کی مہار پکڑے گزرے تھے۔ جس اونٹ پر ان کا غلام سوار تھا اور اسی راستے پر صدیوں بعد مولانا حسرتؔ موہانی اپنا بستر اپنے ہاتھ میں اُٹھائے پیدل چلتے دیکھے گئے۔ مولانا حسرت کے بعد اس شاہراہِ عظیم پر پھر کوئی بہت غریب بہت بڑا آدمی کبھی نظر نہیں آیا۔

مولانا حسرت کی زندگی قدیم وجدید تہذیب اور دین و دُنیا کے صحیح امتزاج کا مکمل نمونہ تھی۔ وہ اس حقیقت کا مجسم ثبوت تھے کہ انسان مذہب اسلام کا سچا پیرو ہو کر بھی جدید فلسفہ اقتصادیات یعنی سوشلزم کی راہ پر گام زن رہ سکتا ہے۔ چنانچہ ایک بار انہوں نے اپنا تعارف یوں بھی کرایا تھا۔

درویشی و انقلاب مسلک ہے میرا
صوفی مومن ہوں اشتراکی مسلم

اس موجودہ ابن زرغفاری کے دور میں اگر حضرت ابوذر غفاری رحمۃ اللہ علیہ کی مقدس شخصیت کے بعد غریب مسلمانوں کا کوئی سچا رہنما دُنیا میں آیا تو بلاشبہ مولانا حسرت موہانی ہی ہیں۔

اُن کا راستہ گھر کی طرف کم جاتا تھا۔ اُن کا راستہ کسی مسجد کی طرف جاتا تھا۔ کسی عوامی جلسہ گاہ کی طرف جاتا تھا یا پھر جیل خانے کی طرف جاتا تھا۔ اُس زمانے میں جیل میں اعلیٰ کلاسیں نہیں ہوتی تھیں۔ سیاسی قیدیوں کو بھی سخت مشقت اُٹھانی پڑتی تھی لیکن مولانا حسرت کا حوصلہ جتنا بلند تھا اتنی بلند قید فرنگ کی دیواریں بھی نہ تھیں۔ ان کا ارادہ جتنا مضبوط تھا۔ اتنا مضبوط وہ لوہا بھی نہ تھا جس کی سلاخیں ان کی کال کوٹھڑی کے دروازے پر لگی ہوتیں یا جس کی زنجیریں ان کے ہاتھوں اور پیروں میں ڈالی جاتیں۔

مولانا کو دو چیزیں بڑی پیاری تھیں۔

"آزادی اور اردو غزل"۔

جب جیل سے باہر ہوتے تب بھی جہاد آزادی کے ساتھ ساتھ غزل گوئی بھی جاری رہتی۔ ایک طرف انگریز سامراجیوں کو للکار رہے ہیں۔ تو دوسری طرف کسی کو مشورہ بھی دے رہے ہیں کہ

ے سامنے سب کے مناسب نہیں ہم پر یہ عتاب
سر سے ڈھل جائے نہ غصّے میں دوپٹہ دیکھو

جب جیل کے اندر ہوتے تب بھی چکی پیستے اور غزل کہتے اور ان حقیقتوں کا یوں اعتراف کرتے۔

اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی

گویا وہ ظالموں پر جتا دینا چاہتے تھے کہ

ے روح آزاد ہے خیال آزاد
جسمِ حسرت کی قید ہے بیکار

مولانا حسرت کی شاعری کے بارے میں میرے محترم اُستاد پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے ایک بار بڑا پُر لطف تبصرہ یوں کیا تھا۔

" حسرت نے شاعری اختیار کی۔ حسرت ہی تھے۔ ان کا کوئی کیا

کر سکتا تھا۔ لیکن کوئی شاعری سے بھی تو پوچھے کہ نیک بخت! تجھے کیا پڑی تھی کہ تو نے حسرت کو اختیار کیا۔! حسرت اور غزل مشکل سے سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ حسرت کی کون سی بات غزل سے مناسبت رکھتی تھی۔! ایک دفعہ میں نے پوچھا"

"کیوں حسرت صاحب۔ آپ کے شعر پڑھ کر تو جو چاہے کسی کے معشوق پر قبضہ کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مولوی بھی ایسا کر سکتا ہے۔۔۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ ان اشعار سے آپ خود بھی کسی معشوق پر قبضہ پا سکے یا نہیں۔؟ اور پا سکے تو کتنے دنوں قبضہ فاسقانہ کا اور اس کے بعد عارفانہ ہو گیا۔؟"

یہ سُن کر حسرت صاحب بچّوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کہنے لگے۔

"بھئی آپ نے یہ لطیفہ خوب کہا"

مولانا حسرت اپنی ساری زندگی حکومت سے دور اور عوام سے قریب تر رہے۔ اتنے قریب کہ انہوں نے ساری زندگی ریل میں عوام کے ڈبے یعنی تھرڈ کلاس میں سفر کیا۔ مولانا شوکت علی مرحوم ایک واقعے کے راوی ہیں کہ مولانا حسرت جب خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے الہ آباد روانہ ہو رہے تھے تو مولانا شوکت علی نے مشورہ دیا۔

"مولانا۔ آپ سیکنڈ کلاس میں سفر کیجئے۔ بی اماں بھی ساتھ ہوں گی مصارف خلافت کمیٹی ادا کرے گی۔"

مولانا ناراض ہو گئے اور بولے:۔

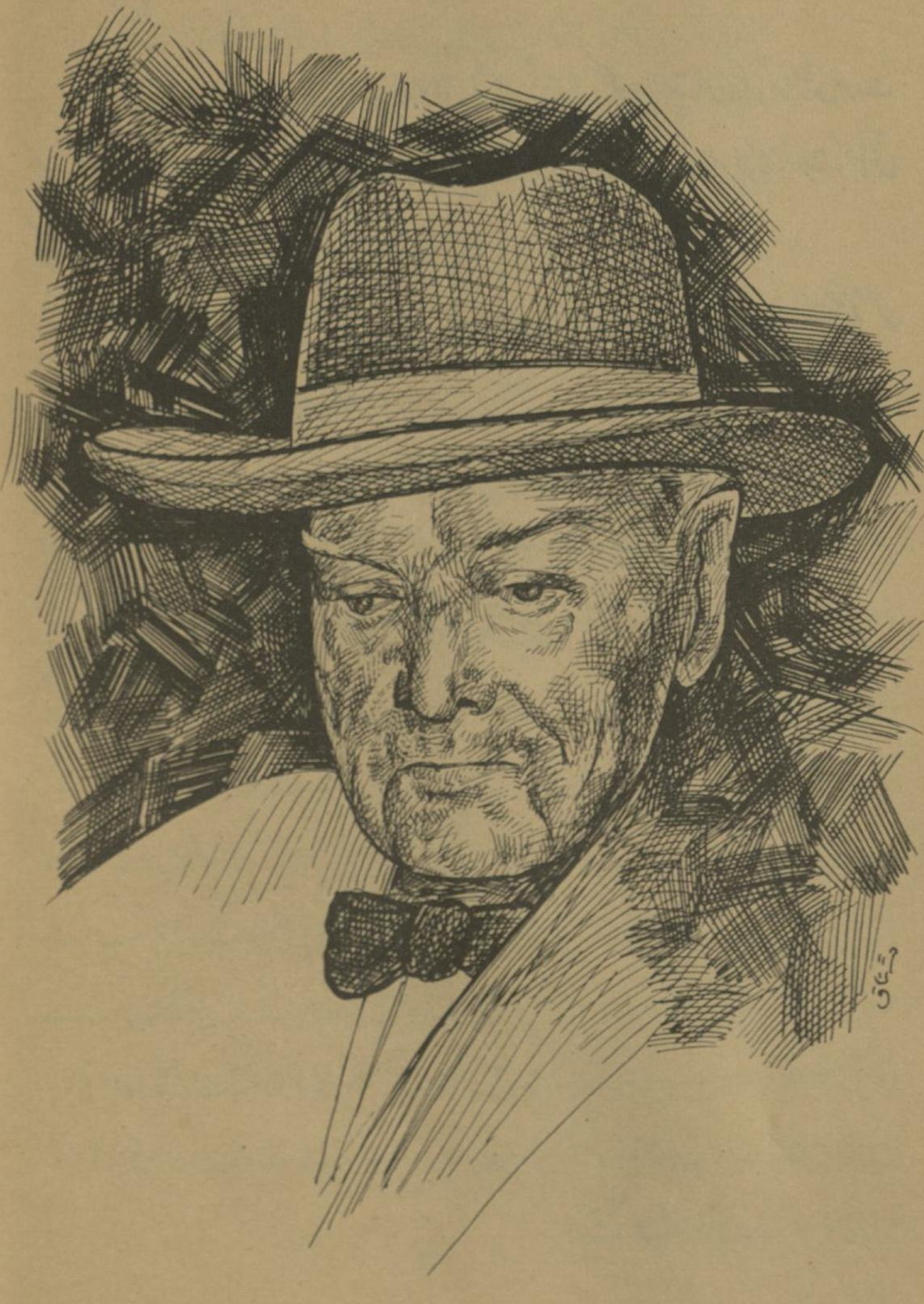
"صدر بننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تیسرے درجے ہی میں سفر کروں گا اور خلافت فنڈ سے ایک حبہ بھی نہیں لوں گا۔"

پاکستان بننے کے بعد ایک بار مولانا حسرت حج کے لئے جاتے ہوئے کراچی تشریف لائے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ایک دن میں امروز کے مرحوم ایڈیٹر ایوب احمد کرمانی کے ساتھ بندر روڈ پر سے گزر رہا تھا کہ عطر و سرمہ کی ایک چھوٹی سی دکان پر مولانا حسرت کو دیکھ کر میں بے اختیار حیرت و مسرت سے چیخ پڑا۔ مولانا نے مجھے دیکھا۔ وہ حیدر آباد دکن میں اپنے نواسے اختر حسن ایڈیٹر پیام کے پاس اکثر آیا کرتے تھے، مجھے فوراً پہچان لیا۔ میں ان کے قدموں میں جھکا تو انہوں نے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ پھر ہم انہیں بہ اصرار امروز کے دفتر لے آئے۔ میاں افتخار الدین اور فیض احمد فیض بھی اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ ہم سب نے مولانا کے ساتھ ایک گروپ فوٹو کھنچوایا۔ میاں افتخار الدین نے اس وقت کے وزیر اعظم کو مولانا کی آمد کے بارے میں فون پر اطلاع دی، لیکن نہ جانے وہاں سے کیا جواب آیا تھا کہ میاں افتخار الدین نے بڑے غصّے سے فون بند کر دیا اور مولانا کو ساتھ لے کر چلے گئے۔

اس کے بعد پھر مولانا حسرت مولانا کو کبھی نہیں دیکھا۔ البتہ ان کی "عارضی موت" کی خبر اخبارات میں پڑھی۔ عارضی موت اس لئے کہ کاتب ازل نے مولانا حسرت موہانی کی زندگی کا آخری صفحہ ابھی تک لکھا ہی نہیں ہے۔

روزِ قیامت دُنیا کا آخری سورج غروب ہو تو حسرت موہانی کی حیاتِ جاوداں کا بھی آخری سورج غروب ہو۔

آخر میں مولانا حسرتؔ کے بارے میں اپنی ایک حسرتؔ کا ذکر ضروری ہے اور وہ حسرتؔ یہ ہے کہ ارضِ ہمالہ کا ہر باشندہ حسرتؔ موہانی بن جائے اور زندگی میں حسرتؔ موہانی کے علاوہ اور کوئی حسرتؔ باقی نہ رہے۔



چرچل

موت کے فرشتے نے نوّے سالہ سر ونسٹن چرچل کے ہونٹوں سے اس کا مرغوب سگار ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔

اس صدی کا سب سے بڑا جنگجو انسان بالآخر اپنی آخری جنگ ہار گیا۔

چرچل پر موت کے فرشتے کا یہ دوسرا حملہ تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۵۳ء میں بھی موت کا فرشتہ چرچل پر حملہ آور ہوا تھا لیکن چرچل سکرات (کاما) کے عالم میں بھی موت کی گرفت سے صاف بچ کر نکل گیا تھا۔

اس کے بعد موت کا فرشتہ غالباً انتظار کرتا رہا کہ چرچل کچھ اور کمزور ہولے چنانچہ جب چرچل بڑھاپے کے اکانوے برس میں داخل ہو رہا تھا تو موت کے

فرشتے نے حملے کے لئے یہ موقع مناسب جانا اور اس پر حملہ کردیا۔ موت کے فرشتے کا غالباً خیال یہ تھا کہ چرچل اب اتنا بوڑھا اور کمزور ہے کہ فوراً ہتھیار ڈال دے گا۔ لیکن ساری دُنیا نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ چرچل نے نوّے برس کی عمر میں بھی اور موت جیسی ناقابلِ شکست طاقت کے مقابلے میں بھی اپنی جنگجویانہ روایات کو برقرار رکھا اور مسلسل دس دن تک موت کے طاقتور ترین فرشتے سے لڑتا رہا۔

:: پچھلی مرتبہ جب چرچل سکرات کے عالم میں بھی موت کی گرفت سے صاف بچ کر نکل گئے تھے تو انہوں نے مزاحاً کہا تھا۔

"میری ازسرِ نو زندگی میری قوتِ ارادی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ میں پیدا بھی اپنی قوتِ ارادی سے ہوا تھا اور مروں گا بھی اس وقت میری جسمانی قوت نہیں بلکہ میری قوتِ ارادی کمزور یا ختم ہو جاتے۔"

اور اس کے بعد انہوں نے اپنی پیدائش میں اپنی قوتِ ارادی کے بارے میں یہ واقعہ سُنایا تھا کہ

"میری ماں یہ چاہتی تھیں کہ میں لندن شہر میں پیدا ہوں لیکن میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ میں لندن میں نہیں بلکہ بلنہم میں پیدا ہوں گا۔ چنانچہ میری والدہ نے لندن جانے کی ساری تیاریاں مکمل کرلی تھیں، اور روانہ ہونے ہی والی تھیں کہ بلنہم ہی میں پیدا ہو گیا"

گویا میری قوتِ ارادی نے پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنا عمل شروع کر دیا تھا اور میری قوتِ ارادی نے ناکامی کا منہ کبھی نہیں دیکھا"

اب یہ بھی یقیناً چرچل کی قوتِ ارادی ہی تھی کہ نوّے سال کی عمر میں دماغ کی رگ پھٹ جانے کے باوجود چرچل دس دن تک موت جیسی ناقابلِ شکست طاقت سے لڑتے رہے، نہ صرف دُنیا کے عام آدمی بلکہ دُنیا کے بڑے بڑے ڈاکٹر تک چرچل اور موت کی اس حیرت انگیز لڑائی پر حیران رہے۔

بہر حال موت نے چرچل کو بھی شکست دے دی۔

اور اس صدی کا "سب سے بڑا عام آدمی" چرچل مر چکا ہے۔

مرنے سے پہلے چرچل انگلستان کے ایک عام آدمی ہی تھے، لیکن ایسے عام آدمی جو انگلستان کی ملکہ سے زیادہ عزت، شہرت اور عظمت کے حامل تھے۔ دنیا کے سب سے قدیم جمہوریہ — برطانیہ میں اب تک ان گنت وزرائے اعظم برسرِ اقتدار آئے لیکن صرف چرچل ہی ایک ایسے وزیرِ اعظم گزرے جن کے نام سے دُنیا کے ہر ملک کا بچّہ بچّہ واقف ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ چرچل وزیرِ اعظم ہی نہیں بلکہ ایک غیر معمولی انسان اور بڑی ہی "پہلو دار شخصیت" تھے۔ سپاہی، سیاست داں، ادیب، مصوّر، حاکم، جنگجو، مدبر اور مقرر، غرض کہ چرچل کیا نہیں تھے۔

چرچل کا انگلستان اور انگریز عوام پر یہ احسان ہے کہ انہوں نے نہ صرف

جزیرہ برطانیہ کو دُنیا کے نقشے سے مٹ جانے سے بچا لیا۔ بلکہ جمہور کی حاکمیت کو بھی نئی زندگی عطا کی۔

اگر دوسری جنگ عظیم میں چرچل کی جگہ کوئی دوسرا وزیر اعظم ہوتا تو ہٹلر نے عوام کا اقتدار دُنیا سے مٹا دیا ہوتا۔ اور دُنیا پر اگر بادشاہت نہیں تو "ایک آدمی کی حکومت" یا آمریت نہ جانے اور کتنی صدیوں تک اس دُنیا اور انسان کو غلامی کے دوزخ میں جھونک دیتی۔

یہ چرچل کی قوتِ ارادی اور خاص طور پر چل کی وہ تقریریں تھیں جنہوں نے جمہوریت کے نہتے علمبردار کو بھی آمریت کے مسلح سپاہی کے سامنے سینہ سپر کھڑا کر دیا تھا۔

چرچل کی شہرۂ آفاق تقریروں کا ایک ہی موضوع تھا۔

"خون، پسینہ، آنسو اور تکلیف"

ادب کے میدان میں چرچل نے سب سے بڑا انعام "نوبل پرائز" (۱۹۵۳ء) بھی حاصل کیا۔

طنز و مزاح کے میدان میں چرچل کی زندہ دلی شگفتہ بیانی اور حاضر جوابی بے مثال ہے جس کے چند نمونے درج ذیل ہیں :-

چرچل کی ۸۲ ویں سالگرہ کے موقع پر ایک نوجوان فوٹوگرافر نے چرچل سے کہا۔

"سر ونسٹن میری خواہش ہے کہ آپ کی ۱۰۰ ویں سالگرہ پر بھی میں ہی آپ کی تصویر کھینچ سکوں۔

۸۲ سالہ چرچل نے اس نوجوان کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نوجوان تمہاری صحت بہت اچھی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ تم میری ۱۰۰ ویں سالگرہ کی تصویریں لینے کے لئے مزید اٹھارہ برس نہ زندہ رہ سکو!

دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکی صدر مسٹر روز ویلٹ چرچل سے ملنے ان کی قیام گاہ پر پہنچے اس وقت چرچل نہا رہے تھے۔ روز ویلٹ کو۔۔۔ ضروری کام تھا۔اس لئے چرچل نے روز ویلٹ کو غسل خانے ہی میں بلوا لیا۔ روز ویلٹ یہ سمجھ کر کہ شاید چرچل کپڑوں میں ملبوس ہوں غسل خانے میں داخل ہو گئے۔لیکن چرچل کو "لباس آدم" میں دیکھ کر واپس ہوا چاہتے تھے کہ چرچل نے کہا۔

" واپس نہ جایئے، ہم انگریز امریکیوں کے گہرے دوست ہیں اور ہمارے پاس دوستوں سے چھپانے کی کوئی چیز نہیں ہے"

فیلڈ مارشل منٹگمری نے اپنی خودنوشت سوانح شائع کی تو کسی نے چرچل سے کہا۔

" فیلڈ مارشل منٹگمری نے اپنی سوانح عمری ایک لاکھ پچھتر ہزار پاؤنڈ میں فروخت کی ہے"

تو حاضر جواب چرچل نے فوراً کہا۔

" فیلڈ مارشل منٹگمری نے برطانوی فوج کی بہترین روایت

قائم رکھی یعنی اپنی زندگی اتنی مہنگی فروخت کردی"۔

برطانیہ کی مردم خیز زمین سے بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوں گی مگر چرچل جیسی پہلودار رنگ برنگی، درس آموز اور عظیم شخصیت شاید ہی پیدا ہو۔

جو بڑا آدمی عام انسانوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے وہ جب مرجاتا ہے تو ساری دُنیا اس کے لئے رو پڑتی ہے۔

چنانچہ آج ساری دُنیا چرچل کے لئے سوگوار ہے۔

۲۷ جنوری ۶۵ء



٧٥

شاہ فاروق

شاہ فاروق ۔ آہ فاروق۔

دُنیا کے بہت پُرانے، رومان انگیز اور تاریخی شہر روم کے نواح میں ایک جگمگاتے "نائٹ کلب" "آئل ڈی فرانس ان" میں مصر کا سابق بادشاہ فاروق ایک اجنبی خوبصورت دوشیزہ کے ساتھ داخل ہوا تھا، لیکن جب وہ باہر نکلا تو اس کے ساتھ کوئی دوشیزہ نہیں تھی بلکہ موت تھی۔

دُنیا بھر کے اخباروں اور خاص طور پہ فرانس اور اٹلی کے نائٹ کلبوں اور نہانے کے ساحلوں پر اب صرف فاروق کی موت کا ذکر ہے۔

رنگیلا فاروق ایک حسین عورت کے بطن سے پیدا ہوا۔

حسین ترین عورتوں کے جھرمٹ میں زندہ رہا۔ اور بالآخر ایک حسین ترین عورت کی آغوش میں مرگیا۔

فاروق کی زندگی "عورت" تھی

اب فاروق مرا ہے تو یوں بھی محسوس ہوتا ہے جیسے فاروق نہیں مرا ہے بلکہ — "قلوپطرہ دوسری بار مری ہے"۔

"قلوپطرہ حسن و عشق اور قصہ کہانیوں کی دلچسپ سرزمین مصر کی ملکہ تھی۔

فاروق مصر کا بادشاہ تھا۔

قلوپطرہ کی زندگی بھی SEX تھی

فاروق کی زندگی بھی SEX تھی

دونوں کی زندگی "قاہرہ" تھی۔

دونوں کی موت "روم" ہے۔

قلوپطرہ کی موت کا باعث ایک "رومن" انطونی تھا۔

فاروق کی موت "روم" میں ہوئی۔

فاروق مصر کی سرزمین میں پیدا ہوا۔

فاروق نے مصر کی سرزمین پر حکومت کی۔ لیکن اس کے باوجود آخری بار مصر کی سرزمین نے فاروق کو اپنی آغوش میں جگہ نہ دی۔

بڑے سے بڑے بیٹے کو بھی ماں اپنی آغوش میں پناہ دیتی ہے۔

لیکن کیا مادرِ وطن۔ انسانی ماں سے بھی زیادہ خود دار ہوتی ہے۔!؟

شاہ فاروق کی زندگی بہت مختصر تھی۔

لیکن جتنی مختصر تھی اتنی ہی بھرپور تھی۔ اور جتنی بھرپور تھی اتنی ہی پہلودار بھی تھی۔

حکومت، دولت اور عورت

ایک بادشاہ کی زندگی

ایک عام آدمی کی زندگی

فاروق کو سب کچھ حاصل ہو گیا تھا۔ اگر زمین پر بھی جنّت اور دوزخ ہیں تو پھر اس دُنیا میں بلاشبہ فاروق ہی وہ اکیلا انسان تھا۔

جو "زمین کی جنّت" میں بھی رہا۔

جو "زمین کی دوزخ" میں بھی رہا۔

فاروق کی زندگی انسان کے عروج و زوال کی بڑی مکمل کہانی ہے، بڑی ہی عبرت آموز کہانی۔

وراثت اور قدرت نے فاروق کو مصر جیسے عظیم اور تاریخی ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا لیکن فاروق جیسے صرف "سیاہ کا مالک" بن گیا۔ صرف رات کا بادشاہ۔

الف لیلہ کا بادشاہ، جو حسین اور فحش عورتوں کے جھرمٹ میں عوام کی محنت

کی شراب کے نشے میں بدمست ہوتا ہے اور اس کے اور اس کی رعایا کے درمیان مفاد پرستوں اور چاپلوسوں کی فصیل حائل ہوتی ہے اور اس فصیل کی اوٹ میں انسانوں پر زندگی حرام ہو جاتی ہے۔

فاروق الف لیلہ کا آخری بادشاہ تھا

فاروق مصر کا آخری بادشاہ تھا۔

فاروق کے ساتھ ہی دُنیا میں بادشاہت کی سب سے پُرانی سرزمین مصر سے بادشاہت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی ہے۔

فاروق اپنے انجام سے بھی بخوبی واقف تھا۔ اسی لئے اس نے ایک بار خود یہ پیشین گوئی کی تھی کہ

عوام سے محبت کرنے والا "امر" ہو جاتا ہے

عوام سے نفرت کرنے والا "مر" جاتا ہے

چنانچہ شاہ فاروق مر گیا ہے۔

"دُنیا میں صرف چار بادشاہ باقی رہ جائیں گے۔ چار بادشاہ تاش کے اور پانچواں بادشاہ انگلستان کا"

چنانچہ جب عوام کی قوت نے اس کے نیچے سے تخت اور اُوپر سے تاج چھین لیا تو فاروق کو کوئی دُکھ نہ ہوا۔

اس کی رفیقۂ حیات ملکہ نے اس سے منہ موڑ لیا۔ اور مادرِ وطن نے اس

سے رشتہ توڑ لیا تب بھی اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔

وطن میں تو وہ "دن رات کا بادشاہ" تھا اور جلا وطن ہو کر صرف "رات کا بادشاہ" ہو کر رہ گیا۔

مصر کی حکومت کی جگہ بحیرۂ روم کے نہانے کے ساحل،

اور "قصر عابدین" کے بجائے پیرس نائٹ کلب۔

فاروق کو پناہ صرف گناہ ہی میں ملی جب تک بادشاہ تھا مصری عوام کی زندگیاں بیچ کر اپنا جامِ شراب بھرتا تھا۔

جب بادشاہ نہ رہا۔ "اپنی زندگی" اخباروں کو بیچ بیچ کر جام میں شراب انڈیلتا رہا۔

جب بادشاہ تھا تب بھی اس کی زندگی رنگیلی تھی۔

جب عام آدمی تھا تب بھی زندگی قوسِ قزح ہی رہی۔

اگر زندگی عورت کی زلفوں کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں کے سوائے اور کچھ نہیں ہے تو پھر بلاشبہ شاہ فاروق کی زندگی بڑی ہی رومانوی، خنک، مہکتی، چہکتی اور بہکتی زندگی تھی۔

اس کی زندگی عمر خیام کی رُباعی۔

موپاساں کا افسانہ۔ اور

فیض کی غزل تھی۔

فاروق کی زندگی بلاشُبہ ایک کہانی ہے۔ بہت سی کہانیاں درسی کتابوں میں شامل نہیں کی جاتیں لیکن فاروق کی زندگی کی کہانی بلاشُبہ ایک درسِ عبرت ہے۔

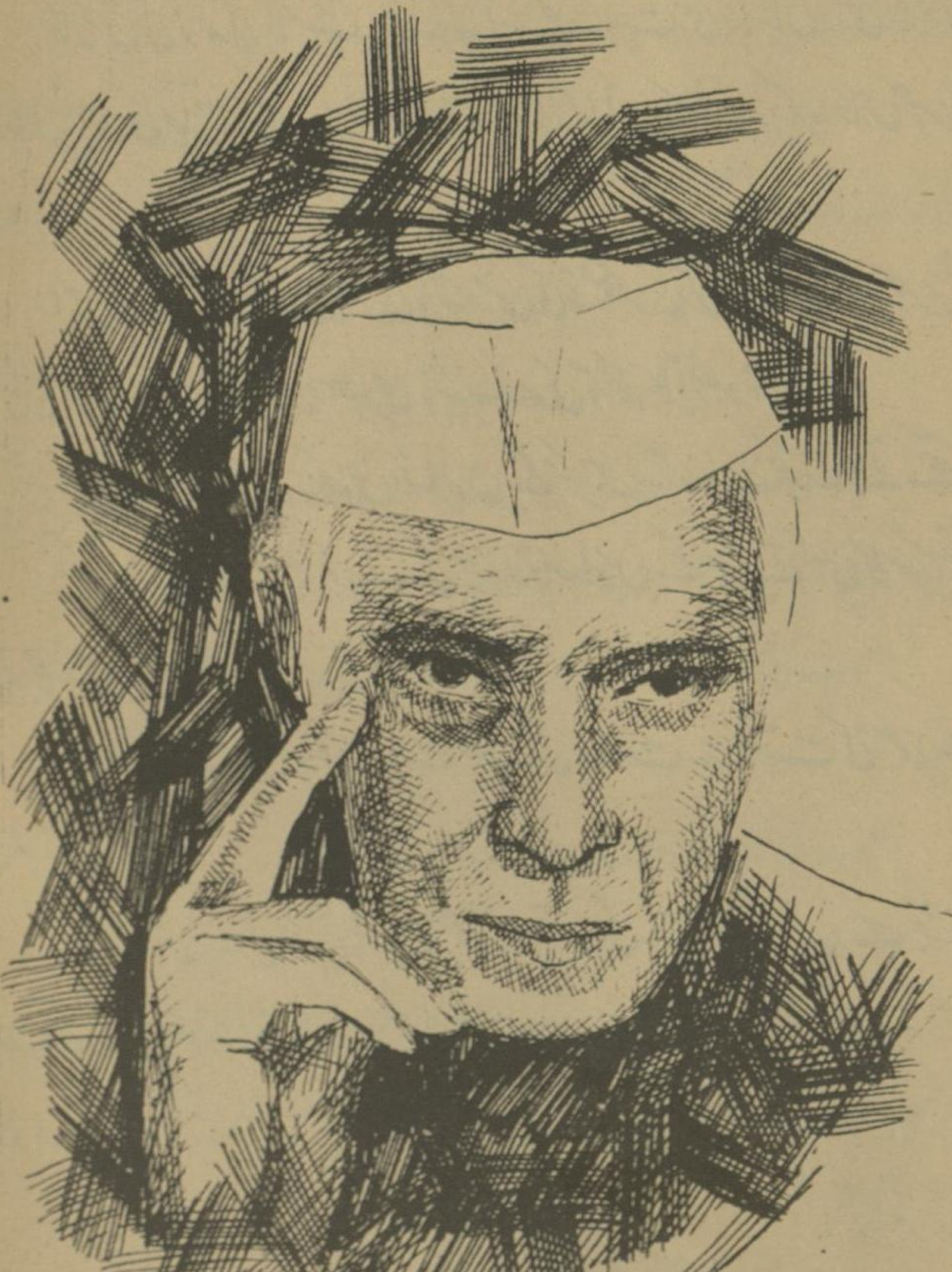
اس کی زندگی لاکھوں مصری باشندوں کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیتی تھی، لیکن اس کی موت ایک بھی مصری باشندے کی آنکھ کا آنسو نہ بن سکی۔

اس کی زندگی میں لاکھوں انسانوں کے سَر اس کے سامنے جُھک جاتے تھے۔

لیکن اس کی موت پر یورپ کی چند رقاصاؤں کے سوائے کسی کا سَر غم کے بوجھ سے نہ جُھکا۔

فاروق نے تاج و تخت سے محبّت کی، دولت سے محبّت کی، عورت سے محبّت کی۔

لیکن اس نے اپنے عوام سے محبّت نہیں کی۔ دُنیا میں سب سے بڑی محبّت "عوام سے محبّت" ہے اور "عوام کی نفرت" سے بڑا جہنم کوئی نہیں۔



جواہر لال نہرو

راج بھون دہلی کے باغیچے میں گلاب کے پھول اب شاخ ہی پر مُرجھا
جائیں گے۔
اس صدی کا۔ گلاب کے پھولوں کا سب سے بڑا عاشق جواہر لال نہرو ہمیشہ کیلئے
اس دُنیا سے جا چکا ہے۔
راج بھون کے وارڈ روب میں پنڈت نہرو کی شیروانیاں ہمیشہ کے لئے ہینگرز
پر ٹنگی رہیں گی۔ اور گلاب کے پھول شاخ ہی پر مُرجھاتے رہیں گے۔
پنڈت جواہر لال نہرو بلا شبہ اس صدی کی چند بڑی شخصیتوں میں سے ایک
تھے۔ دُنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں جو شخص تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی ہو وہ پنڈت نہرو کو

ضرور جاتا ہے۔ اور دُنیا میں جس شخص نے بھی نہرو کی موت کی خبر سُنی ہوگی وہ ایک لمحے کے لئے دم بخود ضرور ہو گیا ہوگا۔ اور آج صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پاکستان میں اور دُنیا کے ہر ملک کے ہر گھر، ہر ہوٹل، اور ہر بازار میں بات چیت کا موضوع نہرو ہی ہوگا۔

نہرو تو اب اس دُنیا میں نہیں ہیں لیکن نہرو کا نام اب سب کی زبان پر ہے۔ اور یقیناً ان لوگوں کو بھی نہرو کی موت پر افسوس ہوگا جنہیں نہرو کی زندگی پر بھی افسوس تھا۔

پنڈت نہرو اس صدی کے چند خوش قسمت انسانوں میں سے ایک تھے۔ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک بام عروج ہی پر رہے۔ وہ ان چند انسانوں میں سے ایک تھے جن کے عروج کو قدرت نے زوال کی پابندی سے آزاد کر دیا تھا۔

میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ وہ گاندھی جی سے زیادہ خوش قسمت تھے۔ وہ گاندھی جی کی طرح اپنے کسی ہم وطن کے ہاتھوں نہیں مارے گئے بلکہ خدا نے انہیں عزت و آبرو کے ساتھ عین اس وقت اُٹھا لیا جبکہ بہت سے ناتھورام گاڈسے نہرو کے لئے بھی اپنے پستولوں میں کارتوس بھر چکے تھے۔

نہرو ان خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی قربانیوں کا انعام پا لیا تھا۔

وہ ۱۰ سال جیل میں رہے اور ۱۷ سال ہی ہندوستان کے حاکم اعلیٰ بھی رہے۔

پنڈت نہرو سے زندگی میں ایک ہی بار بڑی اتفاقیہ اور بڑی دلچسپ ملاقات ہوئی تھی، اپریل ۱۹۶۱ء میں دہلی میں ایک انڈو پاکستان کلچرل کانفرنس ہوئی تھی جس میں پاکستان کا ایک وفد بھی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی قیادت میں دہلی گیا تھا، اس وفد کا ایک رُکن میں بھی تھا۔

اس کلچرل کانفرنس کا افتتاح پنڈت نہرو نے کیا تھا. کانفرنس کے اختتام پر جب پنڈت نہرو ہال سے باہر نکلے تو دروازے پر ہم سب کو رُکنا پڑا کہ پہلے وہ باہر نکلیں لیکن پنڈت نہرو دروازے کے قریب رُک کر پروفیسر ہمایوں کبیر اور دوسرے لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ جب کچھ دیر ہوگئی تو میں نے سوچا کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر باہر نکل جانا چاہیئے۔ لیکن سادے لباس میں ملبوس ایک سیکیوریٹی افسر نے مجھے روک لیا۔ اس وقت پنڈت نہرو بھی قریب پہنچ گئے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے کہہ دیا:۔

مسٹر پرائم منسٹر۔ دیکھئے مہمانوں کے ساتھ یہ کیسا سلوک کر رہے ہیں!!

پنڈت جی نے میرے کوٹ پر لگے ہوئے بیج پر میرے اور میرے ملک کے نام کو غور سے دیکھتے ہوئے میرا بازو پکڑ کر اس سیکیوریٹی افسر سے کہا:۔

"ان کی اچھی میزبانی کرو بھائی یہ ہمارے پاکستانی مہمان ہیں"۔

اور وہ بڑی شفقت کے ساتھ میرا کاندھا تھپک کر چلے گئے۔

پاکستان کے بارے میں پنڈت نہرو کی پالیسی شروع ہی سے غلط رہی، لیکن شاید آخری وقت میں انہیں اس غلطی کا احساس ہوگیا تھا، اور وہ مرنے سے پہلے

اس غلطی کا کفارہ بھی ادا کرنا چاہتے تھے، اور شیخ عبداللہ کا دورہ پاکستان بھی شاید پنڈت نہرو کے اسی کفارے کی ایک ڈھکی چھپی شکل تھا۔

پنڈت نہرو یقیناً ایسے انسان تھے جو اپنا وقت پورا ہونے کے باوجود "بے وقت" مرے۔

ان کی موت ہندوستان اور پاکستان کے اچھے تعلقات کے علاوہ مسئلہ کشمیر کے حل میں بھی مزید رکاوٹ بن سکتی ہے۔

لیکن اگر پنڈت نہرو کے جانشین اپنے محسن رہنما کی رُوح کو واقعی سکون پہنچانا چاہتے ہیں تو یہ ان کا فرض ہی نہیں بلکہ احسان شناسی بھی ہو گی کہ پنڈت نہرو نے جو آخری خواب دیکھا تھا اس کی وہی تعبیر لے آئیں جس تعبیر کی تمنا ہی تمنا میں پنڈت نہرو کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

بہرحال پنڈت جواہر لال نہرو چلے گئے۔

اب راج بھون دہلی کے باغیچے میں گلاب کے پھول شاخوں ہی پر مُرجھا جائیں گے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی شیروانی تو ہینگر پر ٹنگی ہے۔
لیکن اس کے کاج میں کوئی گلاب کا پھول نہیں ہے۔

۳۰ مئی ۶۴ء



خواجہ ناظم الدین

آج پھر آسمان پر جنت کا بڑا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔

جنت کی ساری کھڑکیوں، بالکونیوں اور برآمدوں میں اسلامیانِ ارض ہمالہ کی تاریخ کے سارے معماروں کا ہجوم ہے۔ اژدہام ہے۔

اس ہجوم میں سب سے آگے سر سید علیہ رحمتہ، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبالؒ قائداعظم محمد علی جناح، خان لیاقت علی خان، اے کے فضل الحق اور حسین شہید سہروردی کھڑے ہیں۔

ان کے علاوہ مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ شبیر احمد عثمانی سردار عبدالرب نشتر اور مولوی تمیز الدین پاکستان کے دوسرے بیسیوں محسن جنت

مکین مسنون" کے ہمراہ پل صراط کی طرف سے آنے والے اُس راستے پر اپنی نظروں کے پھول بچھائے کھڑے ہیں، اس راستے سے الحاج خواجہ ناظم الدین حضرت عزرائیل علیہ السلام کے پیچھے پیچھے خراماں خراماں جنت کی طرف جا رہے ہیں۔

سب سے زیادہ علامہ اقبال، قائداعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خاں، اے کے فضل الحق اور حسین شہید سہروردی کو خواجہ ناظم الدین کا نہایت بے چینی سے انتظار ہے۔

جس دن سے قائداعظم محمد علی جناح کی چھوٹی بہن، مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح میدان سیاست میں اتری ہیں، وہ نہایت بے چین سے رہنے لگے ہیں لیکن ان کا دل جیسے اپنی پیاری بہن کے پہلو میں اُتر آیا ہے۔ گویا اب قائداعظم کا جسم تو آسمان پر ہے۔ جنت میں ہے لیکن ان کا دل زمین پر اپنی بہن کے پہلو میں دھڑک رہا ہے۔

خواجہ ناظم الدین جیسے ہی جنت کے بڑے دروازے میں داخل ہوں گے "قائداعظم محمد علی جناح انہیں دیکھتے ہی نہایت بے قراری سے جیسے چیختے ہوئے پوچھیں گے۔

"خواجہ۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ فاطمہ جس کارواں کو لے کر

چلی ہے وہ کہاں تک پہنچا ہے؟"

خواجہ ناظم الدین اپنے مخصوص لہجے میں بتائیں گے:۔

"بحمداللہ۔ جو کارواں پٹیل پارک کراچی سے روانہ ہوا تھا۔ وہ یادگار چوک پشاور، لیاقت باغ راولپنڈی، موچی دروازہ باغ لاہور عیدگاہ میدان حیدر آباد۔ پلٹن میدان ڈھاکہ اور لال ڈگی میدان چاٹگام سے واپس پھر ڈھاکہ کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچا تھا لیکن اتنے لمبے سفر کے باعث میں ۷۰ سالہ بوڑھا آدمی تھک گیا۔ اب میں اور آگے نہ جا سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی مشعل اور اپنا پرچم جنرل اعظم خاں کے ہاتھوں میں تھما دیا اور چپ چاپ سے الگ ہو کر ہمیشہ کے لئے آرام کرنے آپ کے پاس آ گیا ہوں۔"

جب تک میری آنکھیں کھلی تھیں کارواں رواں دواں ڈھاکے تک پہنچ چکا تھا اور اب بھی زمین کی طرف سے اُٹھنے والے نعروں سے یہ جو آسمان ہل رہا ہے اس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے جیسے میرے رُک جانے سے کارواں نہیں رُکا۔ بلکہ کارواں ہنوز رواں دواں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کل تک میں اس کارواں میں آگے آگے چل رہا تھا اور پھر کارواں نے مجھے کندھوں پر اُٹھا لیا۔

نعروں نے واقعی فلک میں تشگاف ڈال دیا ہے۔ اور اس تشگاف سے قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ دیکھ رہے ہیں کہ کارواں واقعی رواں دواں ہے، کارواں کے آگے قائداعظم کی بہن فاطمہ جناح ہیں اور ان کے ساتھ علامہ اقبال کا بیٹا جاوید اقبال

بھی ہیں۔

اور واقعی اہل کاروں نے خواجہ ناظم الدین کو کندھوں پر اُٹھا رکھا ہے۔

خواجہ ناظم الدین نے روز کی پانچ فرض نمازوں میں سے کوئی نماز کبھی قضا نہیں کی تھی۔ انہوں نے جُمعہ کی نماز ہمیشہ عامتہ المسلمین کے درمیان کھڑے ہوکر، رکوع میں جاکر اور سجدہ ریز ہوکر ادا کی تھی۔

لیکن یہ پہلی نماز جمُعہ ہے خواجہ ناظم الدین نہ تو نمازیوں کی صف میں دست بستہ کھڑے ہیں۔ نہ رکوع میں ہیں اور نہ سجدہ ریز۔

بلکہ وہ تو نمازیوں کے سامنے لیٹ گئے ہیں۔ پہلی بار وہ
"نماز جمعہ" نہیں پڑھ رہے ہیں۔! اور آخری بار لوگ ان کی
"نماز جنازہ" پڑھ رہے ہیں!!

محترمہ فاطمہ جناح جو پُر ہجوم کارواں لے کر روانہ ہوتی ہیں اگر اس پُر ہجوم کارواں سے پہلے الحاج خواجہ ناظم الدین پاکستان کے آسمان کی طرف چلے جاتے تو یقیناً پاکستان میں ایک بہت بڑا خلا ضرور پڑ جاتا۔

لیکن خواجہ ناظم الدین عوام کے ایک بڑے ہجوم سے الگ ہوئے ہیں اس لیے احساس ہی نہیں ہوتا کہ خواجہ ناظم الدین ہم میں نہیں ہیں۔ بلکہ یہی محسوس ہوتا ہے جیسے خواجہ ناظم الدین اب بھی موجود ہیں اور اسی ہجوم میں کہیں گُم ہیں۔

عوام کے ہجوم کی کوئی تصویر اُٹھا کر دیکھیے جب تک اس ہجوم میں موجود

بڑی سے بڑی شخصیّت کے چہرے کے گرد حلقہ نہ بنایا جاتے اس وقت تک اس کی شخصیت بلکہ اس "انفرادیت" کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

اب اگر ہجوم میں خواجہ ناظم الدین نظر نہیں آتے تو پھر یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ

خواجہ ناظم الدین کی اجتماعیت تو زندہ ہے۔

صرف ان کی انفرادیت یا شخصیّت مر چکی ہے۔

میں خواجہ صاحب مرحوم سے کبھی نہیں ملا۔ حالانکہ خواجہ صاحب مرحوم جب بھی کراچی آتے مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ میری تحریروں کو بہت پسند کرتے تھے میرے لئے نہایت شفقت سے دعائیں مانگتے تھے۔

میرے متعدد دوستوں سے انہوں نے کہا کبھی جلیس کو بھی پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔

قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی عوام کی راہ نمائی کی ایک عجب رسم پڑ گئی تھی یعنی راہ نما راستے پر آگے چلنے کے بجائے حکومت کی کرسی پر بیٹھ کر عوام کی راہ نمائی کرنے لگے تھے۔

دنیا کی عمر صدیوں برس ہے۔ اس صدیوں برس پرانی دنیا میں از آدم تادمِ تحریر اربوں کھربوں انسان آئے اور آرہے ہیں۔ گئے اور جا رہے ہیں۔ لیکن بہت کم انسان ایسے ہیں جو زندگی کے راستے پر ثابت قدم چلتے رہے۔ اور دنیا کا

سارا گرد و غبار اور کیچڑ بھی ان کی زندگی کے اُجلے لباس کو داغدار نہ کرسکا۔

میں خواجہ ناظم الدین سے کبھی نہیں ملا۔ لیکن میں خواجہ صاحب کے ہمیشہ قرُب رہا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے اور میں بھی ان سے ملنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ساری زندگی میرے اور اُن کے درمیان ایک فاصلہ حائل ہی رہا۔

وہ راہ نما تھے اور میں راہ رو۔ وہ آگے آگے چلتے تھے اور میں ان کے پیچھے۔ بہت پیچھے۔

جب تک حکومت کی کرسی ہے تو عوام، پیارے عوام۔ اور جیسے ہی حکومت کی کرُسی چھِن گئی تو پھر کون عوام۔؟ کیسے عوام!؟

راہ نما کے لئے۔ کرسی

عوام کے لئے۔ آیۃ الکرسی

لیکن ان سارے پُرانے راہ نماؤں میں صرف خواجہ ناظم الدین ہی وہ واحد راہ نما تھے جو کرسی ہو یا میدان ــــ زندگی کی آخری سانس تک پاکستانی عوام کی راہ نمائی میں مصروف رہے۔

ان کی عمر ۷۰ برس کی ہو گئی تھی، وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ڈاکٹروں نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا اور ان کے رشتہ داروں اور قریبی دوستوں کی رائے تھی کہ

"باقی عمر آرام سے یادِ الٰہی میں بسر کیجئے!!"

خواجہ صاحب کے ایک سیکرٹری مسٹر طٰہٰ بن حبیب مجھے بتاتے تھے کہ اس مشورے کے جواب میں خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ

"عوام کی خدمت سے بڑی اور کوئی عبادت نہیں، خدا کے بندوں کی خدمت میں گزرنے والی ہر سانس بجائے خود ایک نماز ہے۔"

چنانچہ خواجہ صاحب اپنی آخری سانس تک ۲۰ برس کے بڑھاپے اور بیماریوں کے باوجود چاٹگام سے پشاور تک اور کراچی سے سلہٹ تک عوام کے ہجوموں کے درمیان ہی چلتے رہے اور بالآخر

عوام کے ہجوم کے کندھوں ہی پر اس دنیا سے اٹھ گئے۔

ان کی آخری سانس بھی ایک نماز ہی تھی۔

دُنیا سے جاتے وقت ان کے پاس صرف جنرل محمد اعظم خان تھے جو انہیں وداع کرنے نہیں بلکہ ان سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ اور انہوں نے خواجہ صاحب کی آخری سانس یوں سُنی تھی۔

انشاءاللہ فتح عوام کو ہوگی۔



سردار عبدالرب نشتر

پیدائش ۱۳ جون ۱۸۹۹ء
وفات ۱۳ فروری ۱۹۵۸ء

مجھے سردار نشترؔ سے ملنے یا انہیں قریب سے دیکھنے کی سعادت کبھی نہ حاصل ہو سکی ہاں البتہ میں ان کی زندگی کے آخری دنوں میں انہیں تقریباً ہر شام کراچی کی وکٹوریہ روڈ پر غالباً ڈاکٹر کی ہدایت کے تحت پیدل چلتا ہوا دیکھا کرتا تھا۔ راستہ چلنے والے انہیں بڑے ادب و احترام سے سلام کرتے تھے۔

میرا بھی بہت جی چاہتا تھا کہ کسی دن ان سے ملوں اور صرف یہ پوچھوں کہ

"اب آپ نہ گورنر ہیں اور نہ وزیر بلکہ ایک عام آدمی رہ گئے ہیں۔ پھر بھی لوگ آپ کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں اور آپ کی شخصیت میں یہ مقناطیسیت کیسی ہے؟"

ایک شام میں نے ارادہ کیا کہ آج سردار نشتر کو سلام کروں گا۔ اور پھر ان کے ساتھ ساتھ چل پڑوں گا اور یہی سوال کروں گا۔

چنانچہ میں اس ارادے کے ساتھ وکٹوریہ روڈ کے چوراہے پر کھڑا ہو گیا اور ان کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن اس شام وہ نہیں آئے۔ پھر کئی شامیں ان کا انتظار کرتا رہا وہ نہیں آئے۔

بالآخر ایک صبح اخبار کے ہاکر نے آواز لگائی کہ

"سردار نشتر وکٹوریہ روڈ پر ٹہلنے کبھی نہیں آئیں گے۔"

پھر میں نے سردار نشتر کی آخری آرام گاہ دیکھی۔ اور اس دن سے آج تک کبھی کبھی یا اکثر یہ ضرور سوچتا ہوں کہ سردار نشتر کی طرح ان کے ہم عصر ہم رتبہ، ہم پلہ اور ہم قد بھی بہت سے مسلمان یا مسلم لیگی رہنما گزرے ہیں لیکن یہ سعادت یا عزت صرف سردار نشتر ہی کو کیوں ملی کہ وہ قائد اعظم مادر ملت اور خان لیاقت علی خاں سے قریب محو دوام ہیں۔؟

ملک غلام محمد بھی تو سردار نشتر کے ہم عصر ہم رتبہ اور ہم مسلک رہنما تھے بلکہ ملک غلام محمد تو عہدہ کے لحاظ سے سردار نشتر سے بھی بہت بڑے تھے یعنی سربراہ مملکت پاکستان تھے!

انہیں ایسا قرب اور ایسی باوقار آخری آرام گاہ کیوں نصیب نہ ہو سکی۔؟

ان کی آخری آرام گاہ کہاں ہے۔؟

ان کی یاد اس طرح ہر سال ادب و احترام سے کیوں نہیں منائی جاتی۔ ؟

"تاریخ عالم میں ایسے سوالات کا مختصر ترین جواب ہے۔

"عوام کا پیار"

جس رہنما کو اس کے عوام کا پیار حاصل ہو جائے پھر وہ اس وقت تک ضرور زندہ رہتا ہے جب تک کہ دُنیا کے اُفق سے سورج طلوع ہوتا رہتا ہے، وہ اپنی جسمانی زندگی کی آخری تھکن سے چور ہو کر ہمیشہ کے لئے زمین میں لیٹ جاتے تب بھی عوام اس کی یاد کو اپنے پیار کا تنفس عطا کر کے اپنے دلوں میں زندہ کر لیتے ہیں،

حضرت خضر علیہ السلام کے بعد "آب حیات" کسی انسان کو میسّر نہیں آیا۔

لیکن میں سوچتا ہوں کہ

"کیا عوام کا پیار۔ آب حیات نہیں ہے ؟"

میں نے تاریخ عالم کے عجائب گھر میں تو یہی دیکھا ہے کہ

"جسے عوام کا پیار میسّر آگیا اس نے جیسے آب حیات پی لیا۔"

"عوام اپنے پیار کا آبِ حیات صرف اس انسان کو پلاتے ہیں جو ان سے بے لوث محبت کرے ان کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے۔ ان کی زندگی، آبرو، مال اور ضمیر کا سودا نہ کرے۔ انھیں دھوکا نہ دے۔ انھیں فروخت نہ کرے، ان کی بے غرض خدمت کرے۔ ان پر حکومت نہ کرے یا ان کے جسموں پر حکومت نہ کرے، بلکہ ان کے دلوں پر حکومت کرے"

عوام نے سردار نشتر کو بھی اپنے پیار کا آبِ حیات پلایا تھا۔

اور یہ وہی عوام ہیں جن میں سو میں سے ننانوے آدمی یہ نہیں جانتے کہ سردار نشتر کے ایک ہم عصر رہنما اور پاکستان کے نہایت طاقت ور اور با اختیار دوسرے سربراہِ مملکت ملک غلام محمد مرحوم کہاں دفن ہیں۔ ؟

یادش بخیر۔ مرحوم غلام محمد کے بارے میں سینہ بہ سینہ چلی آنے والی ایک حکایت یاد آتی ہے کہ۔ جب چند چاپلوسوں اور کاسہ لیسوں نے ملک غلام محمد کو "محافظ ملّت" کا خطاب پیش کیا۔ تو اسی دن ملک غلام محمد جو خُدا کے برگزیدہ بندوں کی خدمت میں بالعموم حاضری دینے کے عادی تھے۔ ایک درویش کے حضور پہنچے۔ اس درویشِ خدامست نے ملک صاحب کو نصیحت کی۔

"اپنے طریقۂ حکمرانی میں تبدیلی کر۔ ان چند چاپلوسوں کی خوشامد پر نہ جا۔ عوام کے دل جیت۔ سنگین جب تک عوام کے سینے پر رہتی ہے وہ خاموش رہتے ہیں۔ جیسے ہی سنگین ہٹ جاتی ہے تیرے خلاف نفرت کا لاوا ان کے منہ سے پھوٹ پڑتا ہے اگر تو نے اپنے طریقۂ حکمرانی میں تبدیلی نہ کی تو جس دن تو گدی سے ہٹے گا یا مرے گا عوام خوشی کا جشن منائیں گے اور تیری یادگاریں اور تیری تصویریں سڑکوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر ہوں گی۔ جیسے ہی ہٹے گا یا مرے گا اس ملک کی تاریخ میں اور مستقبل میں تیرا نام کبھی بھی عزت

احترام سے نہیں لیا جائے گا۔"

راوی بیان کرتا ہے کہ یہ نصیحت سُن کر ملک غلام محمد نے آبدیدہ ہو کر فوراً توبہ کی لیکن اس وقت شاید درِ توبہ بند ہو چکا تھا۔ واللہ اعلم....

جب تک ملک غلام محمد زندہ تھے ان کی کیا شان تھی۔ کیا رُعب تھا۔ کیا دبدبہ تھا۔ بڑے بڑے وزیران کی ایک آواز پہ تھر تھر کانپتے تھے۔ لیکن ایسے بارُعب اور ایسے طاقت ور آہن پیکر حکمران کی نہ اب کہیں قبر نظر آتی ہے۔ نہ برسی منائی جاتی ہے۔ حالانکہ انھیں "محافظ ملت" کا خطاب پیش کرنے والے بہت سے چاپلوس ابھی تک زندہ ہیں ان میں بھی آج تک کوئی ان کی قبر پر ایک پھول تک چڑھاتے نہیں جاتا۔

لیکن اِدھر آؤ اور دیکھو کہ

"یہ سردار نشتر کی قبر ہے یا پھولوں کا ڈھیر۔؟" عوام جنھیں اپنے پیار کا آبِ حیات پلاتے ہیں، ان کی قبر مٹی کی نہیں صرف پھولوں کی ہوتی ہے۔



مولوی تمیزالدین

اخباروں میں مولوی تمیزالدین کی آخری تصویر چھپی تھی
یہ آخری تصویر وہ پہلی تصویر تھی جس میں مولوی تمیزالدین کی آنکھیں بند تھیں،
اور چہرے پر موت کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔
بہت غور سے دیکھنے کے بعد یہ تصویر مولوی تمیزالدین کی تصویر نہیں نظر آتی تھی
بلکہ اُس چراغ کی تصویر نظر آتی تھی جو کوہِ ہمالہ کی زمین کے سیاسی اندھیرے میں دس کروڑ
مسلمانوں کو سیاسی آزادی کا راستہ دکھانے کے لئے پچھلے ۴۰ سال سے جلتا رہا۔
اور وہ ایک دم بجھ چکا تھا۔
لیکن یہ چراغ صرف خود روشنی دے کر نہیں بلکہ اپنی لو سے متعدد چراغوں کو

جلا کر بجھ گیا ہے اسی لئے۔ ع

اب اس کے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

مولوی تمیزالدین پاکستان کی ان چند شخصیتوں میں سے ہیں، جن کی اپنی انفرادی زندگی کوئی نہیں ہوتی بلکہ جو فردِ کے قالب میں جمہور ہوتے ہیں۔ اور جن کی زندگی فردِ واحد کی زندگی نہیں بلکہ جمہور کی زندگی ہوتی ہے۔

وہ ساری زندگی جمہوریت کے لئے زندہ رہے اور اب شاید جمہوریت کے لئے ہی مر گئے ہیں۔

اور اب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس خاکِ پاک میں دبا ہوا یہ تمیزالدین کا جسم تھی یا خاکِ پاک میں "جمہوریت کی جڑ" بو دی گئی تھی ۔۔!

جمہوریت کے علاوہ مولوی تمیزالدین کا جسم اسلامی پاکستانی اور مشرقی تہذیب کے بچے کھچے چند نمونوں میں سے ایک باوقار نمونہ تھا۔

سر پر ٹوپی، چہرے پر شرعی نورانی داڑھی جسم پر شیروانی۔ ان کا چہرہ دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت میں گنتی کے چند "مسلمان چہروں" میں سے ایک ایسا چہرہ تھا جو یورپ اور امریکہ میں بھی بغیر تعارف کے ظاہر ہو جاتا تھا کہ

"یہ مسلمان ہے۔ یہ پاکستانی ہے"

ہر سچا مسلمان جمہوری مزاج ہوتا ہے۔ چنانچہ مولوی تمیزالدین بھی ایک سچے مسلمان تھے اسی لئے وہ جمہوریت کے علمبردار بھی تھے۔

سچی جمہوریت کا راستہ بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ یہ راستہ جیل کی سنگلاخ دیواروں اور آہنی دروازوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ چنانچہ فریدپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ایوب ہال راولپنڈی میں جمہوریہ پاکستان کی دوسری بڑی کرسی تک پہنچنے کیلئے مولوی تمیزالدین خاں کو جیل کی سنگلاخ دیواروں اور آہنی دیواروں سے بھی گزرنا پڑا۔

اور اس ملک میں جب ایک سابق گورنر جنرل مسٹر غلام محمد جمہوریت کا گلا گھونٹنا چاہا تو مولوی تمیزالدین کو ملک کی سب سے بڑی عدالت تک جمہوریت کی بقا کے لئے پاکستان کے سب سے بڑے حاکم سے لڑائی لڑنی پڑی۔

مولوی تمیزالدین ایک صوفے پر سے اُٹھ کر پاکستان کی دوسری بڑی کرسی پر نہیں جا بیٹھے بلکہ بیچ میں انھیں جیل کی آہنی سلاخوں اور زنجیروں کے درمیان سنگین چبوترے پر بھی بیٹھنا پڑا۔ مگر جس کے ہاتھ میں جمہوریت کا پرچم ہوتا ہے۔ اس پر جیل کے دروازے زیادہ عرصے تک بند نہیں رہتے۔ اور جیسے ہی جیل کا دروازہ کھلتا ہے جمہوریت کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔

خلافت سے جمہوریت تک تمیزالدین کے قدم کہیں نہیں ڈگمگائے۔

۶۰ سال بڑی عمر ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں ایک مکمل عمر ہوتی ہے اس لحاظ سے تمیزالدین خاں کی عمر تو مکمل ہو گئی تھی مگر ان کی زندگی کا مقصد یعنی پاکستان میں مکمل جمہوریت کی بحالی ابھی مکمل نہ ہو سکا تھا۔

موت تو اپنے وقت پر آئی۔ لیکن مولوی تمیزالدین اپنے وقت سے پہلے مر گئے۔

پاکستان کو ان کی بہت ضرورت تھی۔ اس وقت جب کہ ملک کی
سیاسی فضا میں بڑا انتشار تھا۔ اور دس کروڑ عوام "مکمل جمہوریت" کے راستے کے
قریب پہنچ چکے تھے۔ تمیز الدین جیسے پارلیمانی راہ نما کی مکمل جمہوریت کے راستے پر
شدید ضرورت تھی۔

کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہوتا جسے سب پسند کریں۔ لیکن بڑی
حیرت کے ساتھ یہ دیکھا گیا کہ مولوی تمیز الدین خاں پاکستان کی ایک ایسی شخصیت
تھے کہ کسی کو بھی ان سے کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔

حد تو یہ ہے کہ "حزب اختلاف" کو بھی ان سے اختلاف نہیں تھا۔

چنانچہ ایسے وقت میں جب کہ ملک سیاسی اختلاف میں بٹا ہوا تھا، مولوی
تمیز الدین خاں کو ابھی اور زندہ رہنا چاہیئے تھا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "قدرت پاکستانیوں سے بڑا کڑا امتحان لے رہی ہے
قائد اعظم سے لے کر مولوی تمیز الدین تک اس قوم کے ہر راہ نما کی موت۔ اس قوم
کا امتحان ہی ہے اور دُنیا کی "تاریخ کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ
مسلمان کی زندگی ہی ایک مسلسل امتحان ہے۔

اسی لئے جمہوریت کا کارواں مولوی تمیز الدین خاں کی قبر پر پھول چڑھا کر پھر
آگے بڑھ جائے گا۔

مولوی تمیز الدین خاں کی قبر بھی منزل کے راستے کا ایک نیا سنگِ میل ہے۔

۱۹ اگست ۱۹۶۳ء



فاطمہ جناح

گونجتا گرجتا سچ

میں نے سقراط کو نہیں دیکھا۔ منصور کا نعرۂ انا الحق بھی میری روح میں نہیں گونجا۔ میں نے سرمد شہید کے لہو کا وردِ حق بھی نہیں سُنا۔ میں نے فاطمہ بنتِ عبداللہؓ کی تصور میں بھی زیارت نہیں کی۔

لیکن میں نے فاطمہ جناح کو دیکھا ہے۔

فاطمہ جناح کو دیکھنے کے بعد گویا میں نے سقراطؔ، منصورؒ، سرمدؒ اور فاطمہ بنت عبداللہ کو بہ یک وقت اکٹھا دیکھ لیا ہے۔

حکیم الامت علامہ اقبالؔ نے فاطمہ بنت عبداللہ کی خدمت اقدس میں یوں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

؎ فاطمہ تو آبروئے اُمت مرحوم ہے

اور جب کبھی میں نے مادرِ ملت پاکستان محترمہ فاطمہ جناح کو دیکھا ہے تو میرے منہ میں بھی بے اختیار اقبال ہی کی زبان تڑپ اُٹھتی تھی کہ

"ہاں ہاں - فاطمہ تو آبروئے امتِ مرحوم ہے"۔

"پچھلے دس برس میں جب "سچائی" کو پاکستان میں چاروں طرف سے دھکے دے دے کر پاکستان سے باہر نکالا جا رہا تھا اور قریب تھا کہ بیچاری پٹی گٹی سچائی سمندر میں گر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائے کہ ساحل سمندر پہ واقع "قصر فاطمہ" کی ایک کھڑکی سے مادرِ ملت فاطمہ جناح کی نظر اس پر پڑی۔ وہ دیوانہ وار اسے غرقاب ہونے سے بچانے کے لئے دوڑیں اور عین گرنے سے پہلے اسے پکڑ لیا بچا لیا۔ اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنے ساتھ قصر فاطمہ میں لے گئیں اور اسے از سرِ نو زندگی عطا کی۔

سچائی کا دشمن "دیوِ استبداد" جو سارے پاکستان میں دندناتا پھرتا تھا۔ جہاں چاہا گھس جاتا تھا لیکن صرف قصر فاطمہ کا پھاٹک ہی ایسا دروازہ تھا جس کے آگے اس کے قدم جیسے سحر زدہ ہو کر رُک جاتے تھے۔ جیسے شل ہو جاتے تھے۔ جیسے مفلوج ہو جاتے تھے۔

اُن دنوں درۂ خیبر سے کاکس بازار تک کہیں بھی سچائی کی پرچھائیں تک نظر نہ آتی تھی۔

سارے پاکستان میں صرف "قصرِ فاطمہ" ہی وہ آغوش تھی جس میں نکھری نِدری سچائی کو اماں ملی تھی۔ فاطمہ جناح نے سچائی کو صرف اپنے گھر ہی میں نہیں بلکہ اپنے دل میں بھی پناہ دی تھی، اسی لئے یوں محسوس ہوتا تھا۔ کہ سچائی مجسم ہو گئی ہے۔ اور اس مجسم سچائی کا "دورِ حاضر میں نام "فاطمہ جناح" ہے۔

گذشتہ دس برس میں ہر مذہبی عید اور قومی تہوار کے موقع پر بارہ کروڑ انسانوں میں صرف ایک ہی سچ بولنے والی آوازِ نطقِ مادرِ ملّت سے ایسی گھن گرج کے ساتھ گونجتی تھی کہ درۂ خیبر سے سندرابن تک سارا پاکستان لرز اُٹھتا تھا اور کاخِ ایوان تک تھرّا جاتے تھے۔

حدیث رسولِ پاک ہے۔

"جابر سلطان کے آگے کلمۂ حق بولنا سب سے بڑا جہاد ہے۔"

اس حدیث پاک کو ہونٹوں سے چوم کر اور آنکھوں سے لگا کر میں نے دیکھا کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے ۹ جولائی ۱۹۶۷ء تک پاکستان کی شیر دل بیٹی اور ملّت پاکستان کی غیور ماں صرف فاطمہ جناح ہی یہ جہاد اکیلی لڑتی رہی۔ بالکل اکیلی۔

ایک طرف روپیہ اور اسلحہ کی طاقت، اور دوسری طرف ایک نازک اور ضعیف خاتون، جس کے پاس بارہ کروڑ انسانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

لیکن میدان جنگ میں انسان کے دل کی دھڑکن ایٹم بم کے دھماکے سے زیادہ فیصلہ کن ہوتی ہے۔

چنانچہ بظاہر تو فاطمہ جناح کو شکست ہوئی لیکن یہی شکست فتح کے خلاف عوام کے دلوں میں نفرت کا لاوا بن کر پھیل گئی۔

میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ فاطمہ جناح کی شکست ہوئی گویا ایوب حکومت کے زوال کا آغاز تھی۔

مجھے اپنی زندگی کے ۳۳ دن مادر ملت کے قدموں میں گذارنے کی خوش نصیبی حاصل رہی ہے۔ گرین پبلشرز کراچی پاکستان کے معمار قائدین کی سوانح حیات شائع کر رہے تھے۔ ایک دن گرین پبلشرز کے منتظم مسٹر عزیزالرحمٰن میرے پاس آئے اور اطلاع دی کہ مجھے مادر ملت نے یاد فرمایا ہے۔

میں حیران بھی بہت ہوا۔ اور خوش بھی بہت، میں فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

مادر ملت نے مجھ سے فرمایا :۔

"میں اردو اچھی طرح تو نہیں جانتی لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ تم ایسے لکھنے والے ہو کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ سے لے کر معمولی پڑھا لکھا آدمی تک تمھاری تحریر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ لہٰذا میں چاہتی ہوں کہ گرین پبلشرز کے لئے تم میری سوانح قلم بند کرو۔ میں جو کچھ تمھیں ڈکٹیٹ کراؤں اسے اپنی زبان میں لکھو اور دوسرے دن مجھے سُنا کر فائینل کر لو تمھیں اس کا مناسب معاوضہ بھی ملے گا۔"

میں نے مادرِ ملّت کے حکم کو سر آنکھوں پر رکھا۔ اور ان کی ہدایت کے تحت ۳۳ دن تک روزانہ تین گھنٹے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ سنتا رہا۔ لکھتا رہا۔ اور پھر ان کی منظوری کے بعد کتاب کی اشاعت عمل میں آئی۔

ان دنوں مادرِ ملّت خود اُردو زبان سیکھ رہی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے خواجہ الطاف حسین حالی کی نظم "بڑھیا اور دیا" پڑھی ہے، یاد ہو تو سناؤ۔ وہ نظم میں نے چھٹی جماعت کی کتاب میں پڑھی تھی، مجھے یاد نہ آئی تو انہوں نے خود اپنی درسی کتاب سے وہ نظم اٹک اٹک کر یوں سنائی۔

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ راہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گزر جاتے ہر ایک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور فانوس سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں کے باہر دیکھیے
ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سُرخ رو آفاق ہیں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

اُس وقت تو بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن اس کے برسوں بعد جب مادرِ ملت نے اپنا انتخابی نشان مٹی کے تیل کی لالٹین" کو پسند کیا تو پھر اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے تصور میں مادرِ ملت ایک بار پھر اسی ترنم سے وہی نظم سُنا رہی ہیں کہ

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ راہ لا کے روشن کر دیا۔

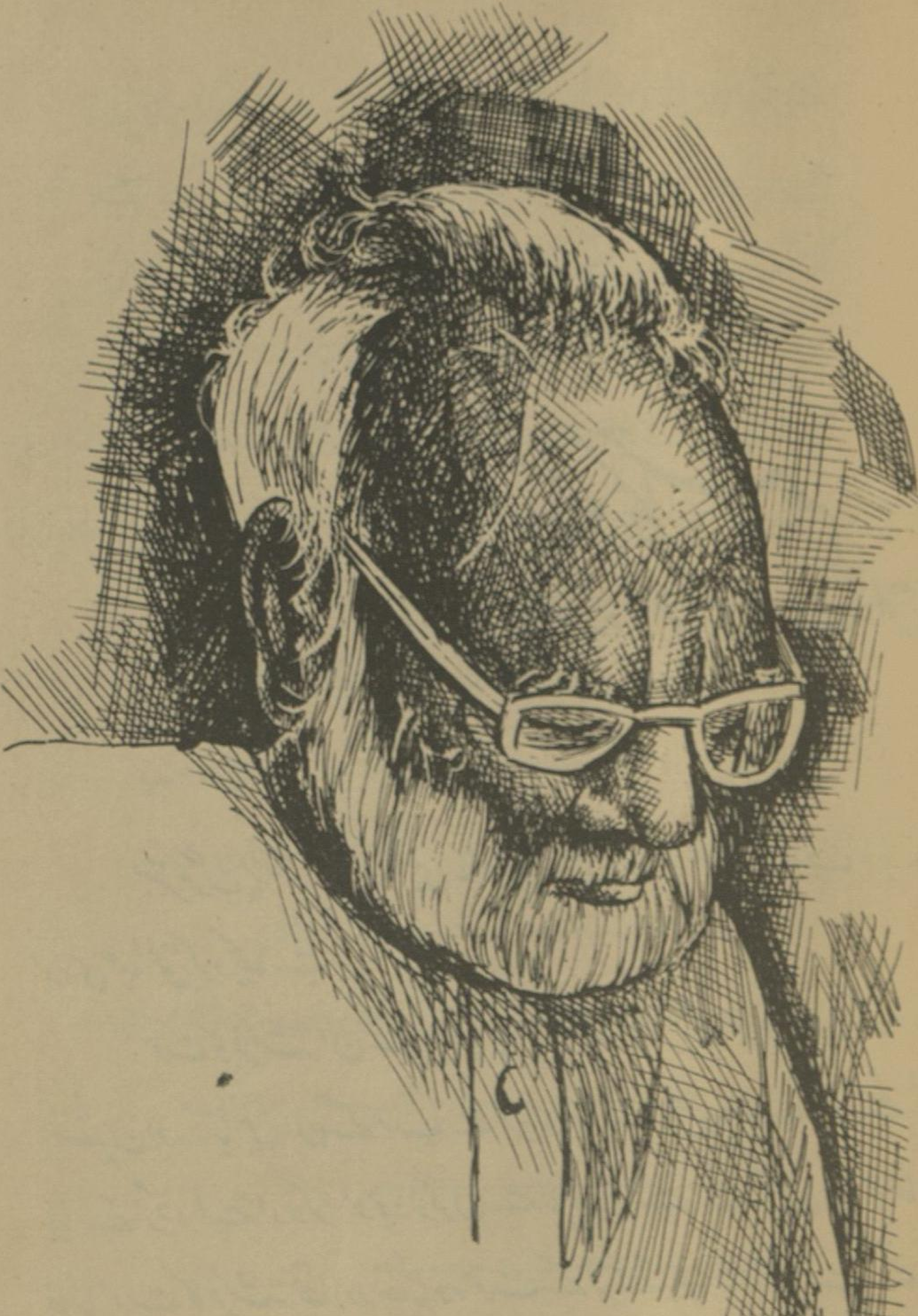
اور بے ساختہ میری زبان سے یہ شعر نکلا ؎

تھا الیکشن کا نشان جلتی ہوئی اک لالٹین
مادرِ ملت نے اس کو دل میں روشن کر دیا۔

مجھے جتنا عرصہ مادرِ ملت کو بہت قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل رہی ہے میں نے ہر لمحہ یہی محسوس کیا کہ قائدِ اعظم کا جسم اب بھی زندہ ہے۔

ہاں البتہ جس دن مادرِ ملت ہمیشہ کے لئے نظروں سے اُدجھل ہوگئیں اس دن ضرور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آج قائدِ اعظم محمد علی جناح جسمانی طور پر پاکستان سے اُٹھ گئے ہیں۔

اس کے بعد سے میں نے سچ کی گھن گرج پھر کبھی نہیں سُنی
اور شاید ایسا "گونجتا گرجتا سچ" پھر کبھی بھی نہ سُنائی دے۔ کبھی نہ سُنائی دے۔



اُردو کا جسم
بابائے اُردو مولوی عبدالحق

بستر مرگ پر مُسکراتے اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے میں نے صرف بابائے اُردو مولوی عبدالحق کو دیکھا ہے۔

موت کا فرشتہ ان کے بالیں پر کھڑا تھا۔ بستر کے اطراف ان کے دوست معتقدین اور دُنیا میں ان کے سب سے قریبی رشتہ دار یعنی طالب علم بیٹھے تھے اگرچہ بابائے اُردو اپنے اردگرد موجود لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔ لیکن ان کا مخاطب غالباً موت کا فرشتہ تھا اور یقیناً وہ موت کے فرشتے ہی سے کہہ رہے تھے۔

"میں کسی ایسے مہینے میں مرنا چاہتا ہوں جس میں کوئی بڑا آدمی نہ مرا ہو۔ لیکن سوائے مئی جولائی اور اگست کے اور کوئی مہینہ

خالی نظر نہیں آتا اور میں مئی، جولائی، اگست کے بے حد گرم مہینوں

میں مرنے کو سخت بدمزاجی سمجھتا ہوں تاہم مجھے اگست کے مہینے

کو منتخب کر لینا چاہیئے کیونکہ اس کے بعد اور اس سے پہلے کوئی

مہینہ کسی بڑے آدمی سے خالی نہیں ہے۔"

ہم سب (اور شاید موت کا فرشتہ بھی) بڑی حیرت سے بابائے اردو کی یہ باتیں سن رہے تھے اور غالباً سمجھ نہیں پاتے تھے اسی لئے بابائے اردو نے اپنی مخصوص دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ سمجھانا شروع کیا۔

جنوری۔ ۴ ———— مولانا محمد علی جوہر

فروری۔ ۲۸ ———— مرزا اسد اللہ خان غالب

مارچ۔ ۲۷ ———— سر سید احمد خان

اپریل۔ ۲۱ ———— علامہ اقبال

مئی۔ ———— (خالی) اب نیاز فتح پوری

جون۔ ۲۵ ———— نواب بہادر یار جنگ

جولائی ————

اگست ————

ستمبر۔ ۱۱ ———— قائد اعظم محمد علی جناح

اکتوبر۔ ۱۶ ———— لیاقت علی خاں

نومبر - ۲۷ ——— مولانا ظفر علی خاں

دسمبر - ۳۱ ——— مولانا الطاف حسین حالی

اس تفصیل کے بعد بابائے اُردو نے فرمایا۔

"اگست کا مہینہ ہی بہتر معلوم ہوتا ہے اور ہم اگست ہی میں کسی دن اس دُنیا سے چلے جائیں گے۔"

ہم سب نے دعا مانگی ۔

"خدا تعالیٰ آپ کو ہم سے کسی مہینے میں بھی جُدا نہ کرے۔"

لیکن غالباً موت کے فرشتے نے بابائے اُردو کی یہ تمنّا بارگاہِ خداوندی میں پہنچا دی اور حق تعالیٰ نے اپنے "عبدالحق" کی یہ خواہش بھی پوری کر دی۔

بات کے دھنی مولوی عبدالحق نے زندگی کے بارے میں جو کچھ کہا وہ بھی پورا کر دکھایا اور موت کے بارے میں بھی جو کچھ کہا وہ بھی پورا کر دکھایا۔

اب رفتگان کی تقویم میں اگست کا مہینہ خالی نہیں ہے۔ پاکستان اور اُردو ادب کی تقویم میں اگست کا مہینہ عبدالحق کا مہینہ ہے۔

۱۸ اگست ۱۹۶۱ء کا دن۔

اور ہر اگست کے مہینے کا اٹھارھواں دن، جہاں سے بابائے اُردو کی حیاتِ جاوداں کا آغاز ہوتا ہے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق بھی خدا کے ان چند خاص اور محبوب بندوں میں

سے ہیں جن کی زندگی کی کتاب کا آخری صفحہ ان کے کاتب تقدیر نے ابھی تک نہیں لکھا۔

اور شاید روزِ قیامت ہی ان کی زندگی کا تمت بالخیر ہو۔

اللہ تعالےٰ اپنے خاص بندوں کو جب دُنیا میں بھیجتا ہے تو شاید ان کے والدین کو بھی ان کی حیاتِ جاوداں سے غیر محسوس طریقے پر مطلع کر دیتا ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ بابائے اُردو کے والدین نے ان کا نام۔ عبدالحق۔ رکھا۔ اور کون نہیں جانتا کہ :۔

"حق" کے مقسوم میں کوئی موت نہیں لکھی ہے۔ ہاں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ:۔

عبد —— اپنی عمر طبعی پوری کر گیا۔

حق —— نے اپنی عمر جاوداں کا آغاز کر دیا ہے۔

۱۸ اگست ۱۹۶۱ء کے دن تک زبان اُردو کا جو "۹۱ برس کا جسم" دُنیا میں چلتا پھرتا ہنستا بولتا تھا۔ اس سے مجھے جتنی زیادہ محبت اور عقیدت رہی اتنی ہی کم قربت حاصل رہی۔

میں بابائے اُردو کی خدمت میں صرف چھ بار حاضر ہو سکا۔

پہلی بار جب بابائے اُردو نے اعلان کیا:۔

"میں اُردو کالج کو اُردو یونیورسٹی بنانا چاہتا ہوں اور اس کے لئے مجھے روپوں کی ضرورت ہے۔ روپیہ مجھے حکومت

بھی دے سکتی ہے۔ لیکن اُردو عوام کی زبان ہے۔ اور اُردو یونیورسٹی
عوام کے لئے تعمیر کی جائے گی۔ اس لئے مجھے روپیوں کی ضرورت ہے"

اس اعلان یا اپیل پر میں تڑپ اُٹھا۔ اس سے پہلے میں کبھی بابائے اُردو سے نہیں ملا تھا۔ لیکن اُردو یونیورسٹی کے لئے عوام کی جیبوں سے روپیہ نکالنے کی خاطر میں نے ایک اسٹیج ڈرامہ لکھا۔ جس کا نام ہے۔

"اُجالے سے پہلے"

یہ ڈرامہ لے کر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھ جیسے نئے ادیب کو بابائے اُردو بھلا کیا پہچانیں گے لیکن جیسے ہی انہوں نے میرا نام سُنا اُٹھ کر نہایت فرطِ محبّت سے گلے سے لگایا میں نے حیران ہو کر کہا۔

"میرے بزرگ۔ آپ زندگی کے راستے پر ۸۰ برس آگے نکل آئے ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ بہت پیچھے آنے والوں کو بھی اس طرح اتنی غور سے دیکھ رہے ہیں کہ میرے قریب آنے پر بھی مجھے فوراً پہچان لیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ آگے دیکھ رہے ہوں گے۔ مستقبل تو آگے ہوتا ہے نا"

بابائے اُردو بڑی شفقت سے مُسکراتے ہوئے بولے۔

"میرا مستقبل تو میرے پیچھے ہے۔ اصل مستقبل تو تم ہو۔ یعنی آنے والی ساری نسل "مستقبل" ہے جو میرے پیچھے پیچھے

آ رہی ہے۔"

میرا دل بڑھ گیا۔ حوصلے بڑھ گئے اور میں نے اپنے بعض دوستوں کی مدد سے وہ ڈرامہ کڑک ہال میں اسٹیج کیا۔ جس رات ڈرامے کا افتتاحی شو تھا۔ اس رات بابائے اُردو کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ مہمان خصوصی تو سیّد ہاشم رضا تھے لیکن "میزبانِ خصوصی" بابائے اُردو ہی تھے۔

میں نے بابائے اُردو کی خدمت میں حاضر ہو کر التجا کی۔

"ایسے لاکھ ڈرامے آپ پر سے نثار۔ آپ آرام کریں۔ آپ تشریف نہ لائیں۔"

وہ پھر کر بستر پر اُٹھ بیٹھے اور بڑے غصّے سے بولے۔

"تم نے اُردو یونیورسٹی کے لئے اتنی محنت سے ڈرامہ لکھا اور بڑی مصیبتوں کے بعد اسے اسٹیج کر رہے ہو تو کیا میں صرف دو گھنٹے کرسی پر آرام سے بیٹھ کر ڈرامہ نہیں دیکھ سکتا!"

ضدی۔ بے حد ضدی مولوی عبدالحق تشریف لائے اور آدھی رات تک ڈرامہ دیکھتے رہے اور پھر رخصت ہوتے وقت بڑی شفقت سے مجھے لگا کر بولے:۔

"دیکھو۔ اب میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں جو کام اُردو کی زندگی کے لئے کیا جاتا ہے وہی کام تو میرے ہر درد کا درماں ہے"

اس کے بعد ایک آخری اور دلچسپ ملاقات یاد آتی ہے۔

اپنی طبیعت کی شوخی کے تحت ایک دن میں نے اپنے اخباری کالم میں بابائے اُردو کی شان میں یوں گستاخی کردی کہ

"بابائے اُردو اُردو یونیورسٹی قائم کرنے سے پہلے "یونیورسٹی" کے لفظ اور اپنے "عربی فارسی آمیز نام" کا اُردو ترجمہ ضرور کرلیں۔"

اور میں نے یہ ترجمہ تجویز کیا تھا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

حکیم مولوی بندہ خُدا

اس کالم کے چھپنے کے بعد ایک گپتی دوست نے مجھے یہ بتایا کہ بابائے اُردو تم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میرے دل میں چور تھا اس لئے ——— میں نے اس جھوٹے دوست کو بھی سچا سمجھ لیا۔ اور ادبی تقریبوں اور محفلوں میں بابائے اُردو سے چھپا چھپا پھرتا رہا۔

لیکن کچھ عرصہ بعد میری ملاقات میرے پیارے دوست اور مشہور نقاد ادیب اور شاعر حضرت مشفق خواجہ سے ہوئی۔ مشفق خواجہ ان دنوں بابائے اُردو کے دست راست تھے۔ میں نے مشفق خواجہ سے پوچھا:۔

"میرے مشفق۔ کیا بابائے اُردو مجھ سے ناراض ہیں؟"

مشفق خواجہ نے مجھے کوئی جواب دینے کے بجائے یہی سوال بابائے اُردو

سے پوچھا اور بابا تے اُڑو دتے اُس کے جواب میں مجھے طلب فرما لیا۔ میں بہت ڈرتے ڈرتے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھے دیکھتے ہی بڑی بے تکلفی سے ہنستے ہوئے اٹھے اور بہت گرم جوشی کے ساتھ مجھے گلے سے لگا کر بولے۔

"بچے۔ میں تو ایسی طفلانہ شرارتوں کو بہت پسند کرتا ہوں، یہ

ہر وقت کی بزرگی، بزرگی، بزرگی۔! میں تو اس بزرگی سے تنگ

آگیا ہوں، تمہاری اس دلیرانہ شرارت نے مجھے ایک بے ساختہ

قہقہہ دیا۔ میں تو اس قہقہے کے لئے تمہارا ممنون ہوں۔"

میں حیران ہو کر سوچنے لگا کہ اس مختصر سے جسم میں اتنا بڑا ظرف آخر کس طرح سمویا ہوا ہے۔!!

اس کے بعد انہوں نے پوچھا۔

"تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آیا کرتے۔؟"

میں نے جواب دیا۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ لوگوں کو مالی امداد دینے یعنی

قرض دینے کے معاملے میں خاصے رقیق القلب واقع ہوئے

ہیں۔ اس لئے میں آپ سے نہیں ملنا چاہتا۔"

"میں سمجھا نہیں۔ تم نے کیا کہا۔؟"

میں نے بات کھول دی۔

"میں نے سُنا ہے کہ آپ ہر شخص کو قرض دیتے ہیں، اگرچہ
میں ایک بہت ہی خوش حال صحافی اور ادیب ہوں تاہم جب
میں بھی آپ کے سامنے آتا ہوں تو جانے کیوں میرا جی چاہتا ہے
کہ میں بھی آپ سے قرض مانگ بیٹھوں۔"

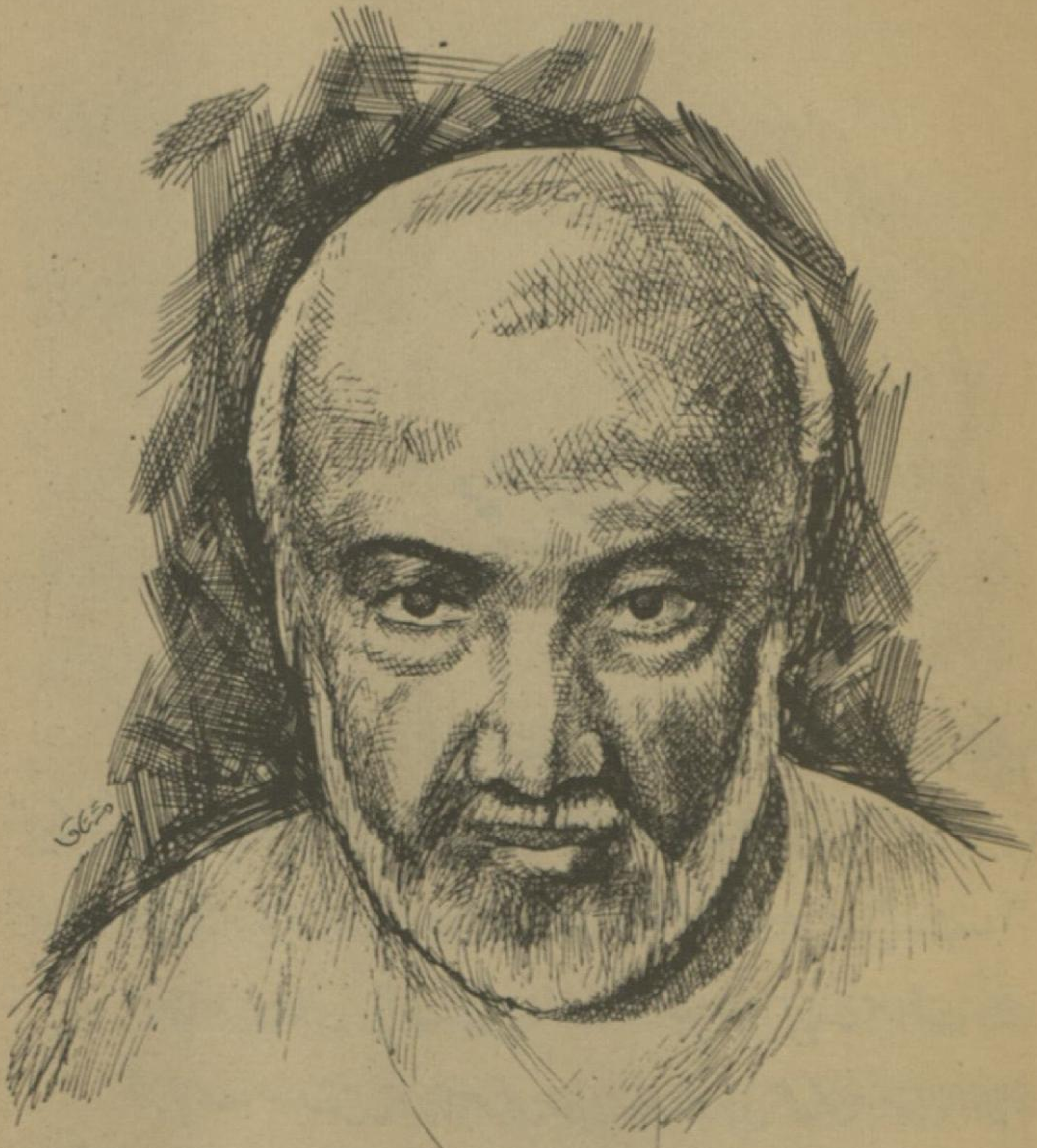
میری یہ بات سُن کر وہ بہت ہنسے بڑی دیر تک ہنستے رہے۔

اس کے بعد بابا تے ارڈ وسے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ ان کو بستر مرگ پر ضرور دیکھا ہے۔

اب ان سے ملاقات ہو گی بھی نہیں۔

وہ جنت میں ہوں گے۔

اور میرے لئے جنت میں کہاں جگہ۔!؟



مولانا ظفر علی خاںؒ

آزاد، باضمیر، بے باک اور حق پرست اخبار نویسی کو اگر کوئی جسم اور اسم عطا کیا جائے تو بلاشبہ وہ جسم اور اسم مولانا ظفر علی خاں یا مولانا حسرت موہانی یا مولانا محمد علی جوہر یا مولانا ابوالکلام آزاد یا خواجہ حسن نظامی یا حمید نظامی ہی کا جسم اور اسم ہو سکتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں پاکستانی صحافت کے جدِّ امجد یا بابائے صحافت تھے۔

اگر ہمارے اسلاف میں مولانا ظفر علی خاں، حسرت موہانی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور خواجہ حسن نظامی نہ ہوتے تو ہم آزاد صحافت، باضمیر اور باایمان صحافی سے واقف ہی نہ ہوتے۔

مولانا ظفر علی خان نے آزادی صحافت کے عَلَم کو غیر ملکی آقاؤں یعنی انگریز کے

خلاف اس پُر آشوب زمانے میں بلند کیا جب کہ انگریز سے بڑی طاقت دُنیا میں کوئی نہ تھی اور اس کی طاقت کا آفتاب غروب ہی نہیں ہوتا تھا۔

اس زمانے میں قومی صحافت بھی نئی نئی معرضِ وجود میں آئی تھی اور قومی صحافت کا نہ کوئی پس منظر تھا۔ اور نہ کوئی نشانِ راہ روایات ۔۔ وہ صرف بائے بسم اللہ سے شروع ہوئی تھی، اور آگے جو راستہ بنتا گیا وہ مولانا ظفر علی خان اور ان کے رفقاء کے قدموں سے بنتا چلا گیا جو اب اُوجِ ثریا کی منزل کی طرف جانے والا پختہ راستہ بن گیا ہے۔

طاقتور ترین دشمن انگریز کے مقابلے میں مولانا ظفر علی خاں اور ان کا اخبار زمیندار کیا حیثیت رکھتے تھے لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت کے خاتمے کا فرمان لکھنے کے لئے جو کاغذ استعمال کیا گیا وہ زمیندار کا نیوز پرنٹ بھی تھا اور اس فرمان کو لکھنے والا ایک قلم مولانا ظفر علی خان کا بھی قلم معجز رقم تھا۔

مولانا ظفر علی خاں اپنے وقت کے منصُور تھے انگریز حکمران کے ظلم کے خلاف سچ لکھنے کے جُرم میں انہوں نے مجموعی طور پر کوئی بارہ سال جیل کاٹی اور بار بار ان کا اخبار بند اور ضمانتیں ضبط ہوتی رہیں لیکن مولانا ظفر علی خان کے حق رقم قلم اور جہاد کے لئے ثابت اور مضبُوط قدم میں ذرا سی بھی لغزش نہ پیدا ہوئی۔

مولانا پر داروگیر کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب پنجاب کا گورنر سر مائیکل اڈوائر تھا اور مولانا نے انگریز حکمرانوں کے خلاف ایک مضمون کا عنوان اس شعر کو بنایا تھا ؎

چہار چیز است تحفۂ لندن

خمر و خنزیر و روزنامہ زن

اس مضمون میں انہوں نے برطانوی پریس ایکٹ کی پابندیوں کی دھجیاں بکھیر کے رکھ دی تھیں، نتیجتاً اوڈوائر نے زمیندار سے دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کی پھر اس کے بعد پابندیوں، ضمانتوں، ضبطیوں اور قید و بند کا جو سلسلہ مولانا سے چمٹا تو قیام پاکستان کے ساتھ ہی چھوٹا۔

زمیندار کی ضبطی کے بارے میں مولانا کی ایک معرکتہ الآرا نظم بڑی مشہور ہے جس کے چند شعر تبرکاً درج ذیل ہیں۔

حق کا نہ کر اظہار کہ قانون یہی ہے

فرماتی ہے سرکار کہ قانون یہی ہے

دل ضبط، زبان ضبط، فغاں ضبط، قلم ضبط

دُنیا میں بھلا ہوں گے یہ سامان کہیں ضبط

مظلوم کو فریاد بھی کرنے نہیں دیتے

ڈر ہے کہ نہ ہو جائے یہ سب امن و اماں ضبط

وہ ضبط کریں میری دوات اور قلم کو

ہو جائیں گے خود ان کے تفنگ اور سناں ضبط

تم ضبط زمیندار کے نمبر نہیں کرتے

کرتے ہو حقیقت میں محمد کا نشاں ضبط

زمیندار کی ضبطی کے بارے میں ان کا ایک اور معرکتہ الآرا شعر یہ ہے :-

ے مری روزی نہ کی قرق اس نے میری سرکشی پر بھی

خداوندانِ لندن سے میرا پرور دگار اچھا

اپنے طاقت ور آقا انگریز کو وہ یوں للکارتے ہیں ے

بچا لیا تمہیں توپوں نے اور تفنگوں نے

مزا تو جب ہے کہ مظلوم کی فغاں سے بچو

اپنی قید و بند کی زندگی کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ے

جب آئے ہم جیل میں تو تم پر کھلا فرنگی ازل کے دن سے

دروغ گو بھی ہے حیلہ جو بھی کمینہ بھی ہے لئیم بھی ہے

یہ کہہ کر حق جتا دوں گا محمد کی شفاعت کا

کہ آقا تیری خاطر میں نے چکی جیل میں پیسی

مولانا اور زمیندار کے بارے میں مولانا وحید الدین سلیم نے فرمایا تھا ے

زندہ اقوام کے مرتے نہیں اخبار کبھی

مٹ نہیں سکتا مٹانے سے زمیندار کبھی

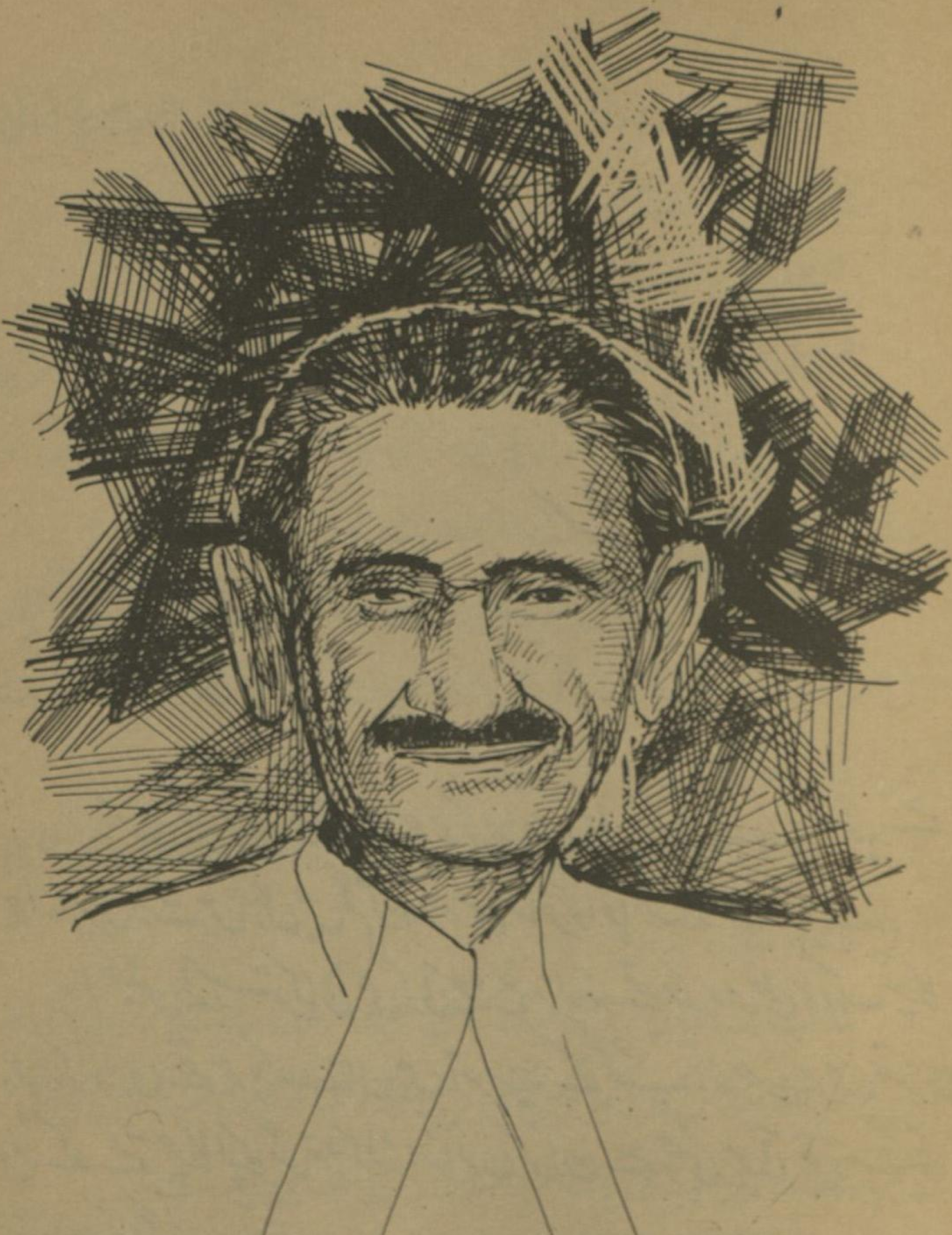
افسوس کہ اب نہ مولانا ظفر علی خاں ہیں اور نہ زمیندار۔ لیکن اب بھی

یہی محسوس ہوتا ہے جیسے ؏

آرام قلندر کو تہہ خاک نہیں ہے

اور مولانا کی روح زمین پر ہی اب تک مضطرب و بے قرار ہے۔ جبھی تو کسی نے کہا ہے :-

رفتید و لے نہ از دل ما



رستم کیانی

آسمانی بجلی کا وہ لمحاتی چکا چوند کوندا اس چراغ قبر سے بدرجہا مفید ہے جو اندھیری رات میں جنگل میں گم کردہ راہ کسی مسافر کو اچانک راستہ دکھا دے۔

جسٹس محمد رستم کیانی بھی کوئی چراغ مزار نہ تھے بلکہ وہ بجلی کا ایک چکا چوند کوندا ہی تھے جو پاکستان میں آمریت کے گھپ اندھیرے میں تھوڑی دیر کے لئے چمکا لپکا مگر تیرہ کروڑ انسانوں کو ان سے چھپی ہوئی جمہوریت کی نئی راہ دکھا گیا۔

جسٹس محمد رستم کیانی۔ اب جس کے وجود سے بہشتِ بریں مہک رہا ہے۔ زمین پر ساٹھ برس تک زندہ رہا لیکن اس کی صحیح عمر صرف ۲۴ برس تھی۔

وہ ۲۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کو پہلی بار آمریت کے خلاف قلم بدست پاکستانی عوام کے سامنے آیا۔ اور جب اس نے پاکستان کے عوام سے کہا:-

"خَلَقَ الاِنْسَانَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ ہ"

"یعنی خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان کرنا سکھایا۔ لہٰذا اگر میں اپنا دردِ دل بیان نہ کر سکوں تو گویا میں اپنی پیدائش کا منشا پورا نہ کروں" تو سارا پاکستان اس کی صدائے درمند سے چونک پڑا۔

ہر چند کہ جسٹس کیانی کی زندگی بڑی مختصر تھی، لیکن بعض چھوٹی زندگیاں اتنی منوّر اور اتنی جگ مگ ہوتی ہیں کہ برسوں سے جلنے والے مدھم چراغوں سے کہیں زیادہ راہ نما ثابت ہوتی ہیں۔

کیانی مرحوم بھی ایک ایسے ہی بہت جلد جلنے اور بہت جلد بجھنے والے چراغِ راہ نما تھے۔

جب تک کیانی مرحوم چیف جسٹس رہے انہوں نے بے شمار بے گناہ قیدیوں اور نظر بندوں کو رہا کیا لیکن کسی کو بھی علم نہ تھا کہ خود چیف جسٹس کیانی کے جسم کے اندر اپنی طرز کا ایک منفرد طنز و مزاح نگار بھی قید ہے۔

چیف جسٹس کیانی تو کھلا رستم تھا اور آمریت شکن طنز و مزاح نگار رستم۔ چھپا رستم۔ تھا۔

سچا اور اچھا منصف (جج) کسی بے گناہ مصنف کو بھلا کب تک قید

رکھ سکتا ہے ؟ چنانچہ جیسے ہی آمریت کے گھُپ اندھیرے میں پاکستانی عوام کو ایک آمریت شکن قلم کی ضرورت محسوس ہوئی منصف کیانی نے اپنے جسم میں نظر بند مصنف کیانی کو آزاد کر دیا۔

دسمبر ۱۹۵۸ء سے پہلے رستم کیانی کرسیٔ عدل پر تو بیٹھا نظر آیا۔ لیکن راہ نماؤں کی صف میں اور صف اوّل کے مصنفوں کے درمیان دسمبر ۱۹۵۸ء کے بعد ہی نظر آیا۔

دسمبر ۱۹۵۸ء کے دوسرے ہفتے کراچی بار ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک تقریب میں جسٹس کیانی مہمان خصوصی تھے۔

اعلیٰ سرکاری عہدیدار جلسوں میں صدر، مہمان خصوصی تو ہوتے ہی ہیں۔ اس لئے ان کی صدارت بظاہر کسی اہمیت کی حامل نہ تھی لیکن جب وہ مائیکروفون کے سامنے آئے اور عوام نے پہلی بار ان کی گل افشانیٔ گفتار دیکھی تو حیرت سے چونک پڑے کہ

یہ منصف کتنا بڑا مصنف ہے !

یہ رُستم کیانی تو چھُپا رُستم نکلا۔ !

بس پھر اس تقریر کے بعد سے سارے پاکستان میں کیانی کا نام گونجنے لگا۔ اب کیانی صرف جلسوں کا مہمان خصوصی بننے لگا۔ اور آمریت کے خلاف طنز و مزاح کو اس طرح استعمال کرتا رہا جس طرح بچّوں کی کہانیوں کے ایک ننھے

کردار نے دو سینگوں اور ایک آنکھ والے بھیانک دیو کو زہریلے چاکلیٹ کھلا کر مار دیا۔ وہ بھیانک دیو اس ننھے ہیرو کے چاکلیٹ بخوشی بڑا مزا لے لے کر کھاتا رہا۔ بعد میں اس کے زہر سے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

پاکستان کو جمہوریت کی راہ پر ڈالنے والے مجاہدوں میں رستم کیانی بلاشبہ اگلی صف میں نہایت نمایاں ہے۔

اب کیانی صاحب کی ایک ایک بات یاد آتی ہے۔ ایسی بات بھی جو پہلے کسی کتاب میں شائع نہیں ہوئی۔

ایسی ہی ایک بات یہ تھی کہ جب کیانی صاحب نے اپنی انگریزی تقریروں کا مجموعہ مرتب کیا تو اس کا نام رکھا۔

"دی ہول ٹرتھ" (مکمل سچ)

مگر اس زمانے کی سب سے بڑی شخصیت نے کیانی صاحب کی مرضی کے خلاف اس کتاب کا دیباچہ لکھ بھیجا۔ کیانی صاحب اس دیباچے کو شامل کرنے کے لئے بوجوہ مجبور ہو گئے۔ البتہ انہوں نے اس دیباچے کی شمولیت کے ساتھ کتاب کا نام ہی بدل دیا۔ یعنی

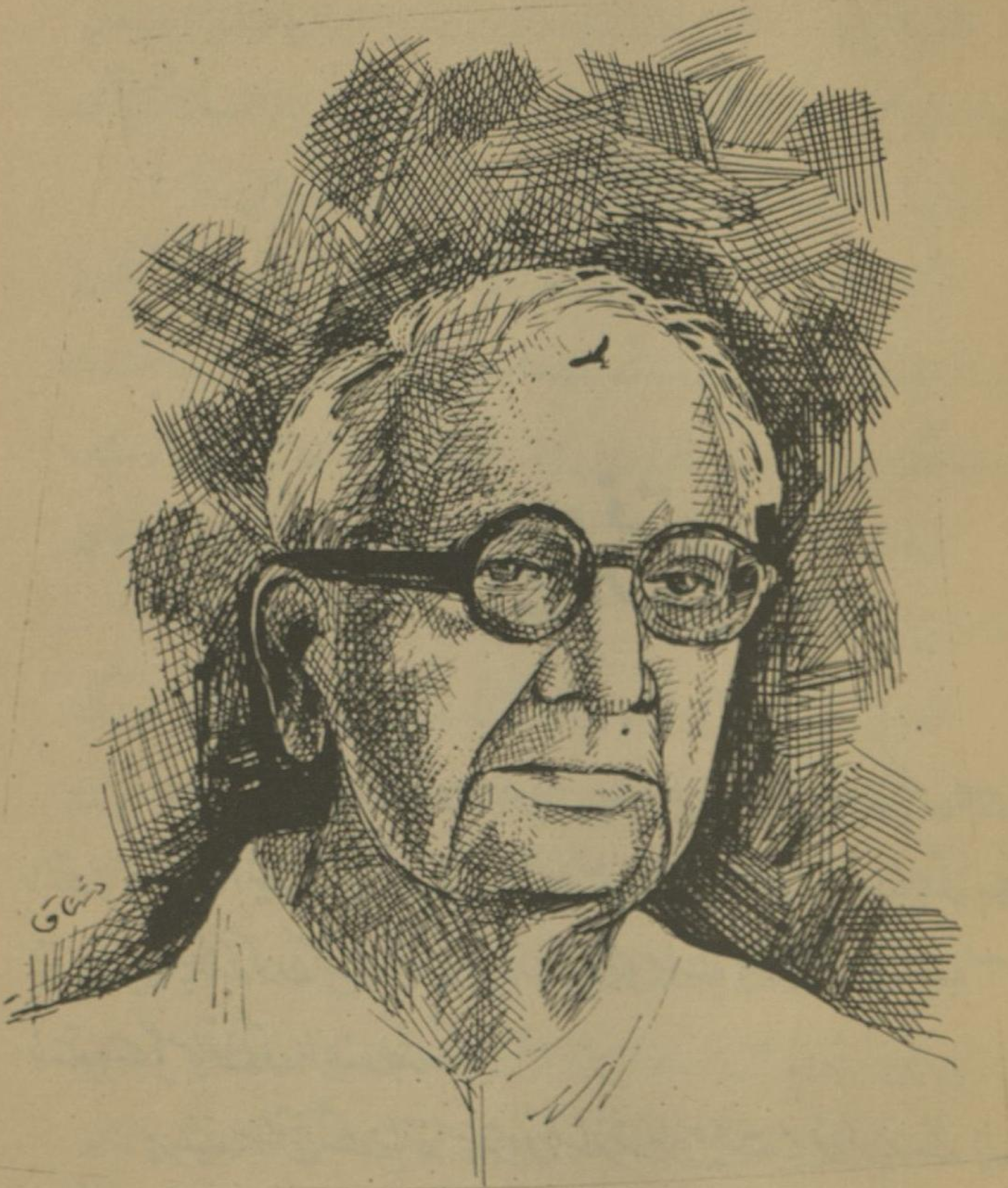
ناٹ دی ہول ٹرتھ

(یعنی مکمل سچ نہیں)

آج کا دن کیانی کا دن ہے۔ آج وہ پیش گوئی بھی یاد آ رہی ہے

جو کیانی مرحوم نے خود اپنی موت کے بارے میں کی تھی کہ

سوچتا تھا کدھر گیا رستم
آئی آواز مر گیا رستم
جب کبھی یاد اس کی آئے گی
اس کی شوخی مجھے ستائے گی



نیاز فتح پوری

انسانی زندگی کا راستہ سو سوا سو برس سے زیادہ لمبا نہیں ہے لیکن اس راستے پر از آدم تا اینندم اتنی آدک جادک، اتنی چہل پہل اور اتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون کب دشت عدم سے شاہراہِ حیات پر آیا اور کون کب اس راستے سے آسمانوں کی طرف بھٹک گیا۔

ہر نئے سورج کے ساتھ سینکڑوں مسافر شاہراہِ حیات پر نمودار ہوتے ہیں اور سینکڑوں پرانے مسافر غروبِ آفتاب کے ساتھ ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

لیکن ہر زمانے میں اس راستے پر بعض انسان ایسے بھی نمودار ہوتے ہیں کہ ان

کا قافلہ دوسرے راہگیروں سے بلند ہوجاتا ہے اور ان کا وجود اور ان کا نام شہرت کی دھوپ اور ہر دلعزیزی کی چاندنی سے چمکنے و مکنے لگتا ہے تو پھر وہ سب کا مرکز نگاہ بن جاتے ہیں اور پھر وہ سارے زمانے کو ساتھ لے کر چلنے لگتے ہیں۔

پھر جب کبھی چلتے چلتے تھک کر کسی "سنگِ برس" پر وہ آسمانوں کے گلستانوں کی طرف مڑ جاتے ہیں تو پھر اس راستے سے دھوپ اور چاندنی ایک دم غائب ہو جاتی ہے اور غم کے کالے گھنے بادلوں کا اندھیرا شاہراہِ حیات پر پھیل جاتا ہے۔

اس دن جیسے سورج طلوع ہوتا ہے اور نہ چاند نکلتا ہے۔ کیونکہ وہی انسان تو چاند سورج ہوتے ہیں!

علامہ نیاز فتح پوری بھی ایسے ہی ایک آفتاب ماہتاب انسان تھے۔ جن کے وجود کے سورج اور حسن کی شخصیت کی چاندنی نے ۱۸۸۴ء سے ۱۹۶۶ء تک پورے ۸۲ برس شاہراہِ حیات کو منور فروزاں اور جگ مگ جگ مگ رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ ماحول یا زمانہ انسان کی شخصیت کی تخلیق کرتا ہے لیکن بعض انسان ایسے بھی اس دنیا میں آتے ہیں، جو ماحول یا سارے زمانے کے خالق ہوتے ہیں،

علامہ نیاز فتح پوری بھی بلاشبہ انہی چند آفرینندہ عہد شخصیتوں میں سے ایک نہایت نمایاں اور بے مثال شخصیت ہیں۔

علامہ نیاز فتح پوری ایک جامع الحیثیات شخص تھے۔ ادیب، شاعر، صحافی، نقاد، مورخ، فلسفی، عالم، مقرر، سپاہی، طبیب، نجومی، پامسٹ، باغی، صندی، ہنسوڑ، مفرور

منکسر المزاج، عاشق، مرد، شوہر، باپ، دوست، دشمن، صنم پرست، بت شکن، دل مومن دماغ کافر، اسی جامع الحیثیات شخصیت کے بارے میں حضرت جوش ملیح آبادی کے سوائے اور کون ایسے بے مثال حروف آخر لکھ سکتا ہے۔

حضرت جوش فرماتے ہیں۔

"حضرت نیاز اُن چند گنے چنے استثنائی افراد میں سے ہیں، جن کے پیدا کرنے کے معاملے میں یہ دُون پرور آسمان سے لے کر اب تک بخل کرتا چلا آرہا ہے۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں اتنی خلاقی کے شہر آباد ہیں اتنے شعور بے فکر پڑاو ڈالے ہوتے ہیں، اور رامس و رنگ کی اتنی براتیں اُتری ہوتی ہیں تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ان کو کلیجے سے لگا لوں۔"

علامہ نیاز فتح پوری کس کے محسن نہیں تھے کہ میرے محسن نہ ہوتے۔ مجھ پر تو ان کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے ہی مجھے سب سے پہلے شہرت کے اُجالے میں دھکیلا تھا، اب میں مڑ کر ۲۶ برس دور پیچھے دیکھتا ہوں، ماضی کی سہانی چاندنی چٹکی ہوتی ہے، ادب کے شہر میں بڑی گھما گھمی اور بڑی چہل پہل ہے۔ کمال سخن کے دالانوں میں بڑی واہ واہی ہوئی ہے۔ اور اس واہ واہ میں سب سے زیادہ گونجیلا نام نیاز فتح پوری ہی کا ہے۔ اور ان کا "نگار" نگار ہائے فتنہ گر سے زیادہ دلاویز نگار دل آرا!

ہمارے گھر میں چند رسالے آتے تھے۔ نگار، عصمت، ساقی، ہمایوں، نیرنگ خیال، زمانہ، معارف اور ادب لطیف۔ میرے والد محترم صرف نگار کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اسکول کا طالب علم ہونے کے باعث نگار میرے لئے ایک نہایت خشک اور بے مزہ اور فہم سے بالاتر رسالہ تھا۔ لیکن ایک دن میرے والد اپنے کسی ادیب اور شاعر دوست سے کہہ رہے تھے۔

"بھئی۔ میں تو تمہیں اسی وقت ادیب اور شاعر تسلیم کروں گا جب تمہاری کوئی تحریر علامہ نیاز فتح پوری پسند کریں اور نگار میں شائع کریں۔"

والد محترم کی یہ بات میرے لوح ذہن پر جسم کر رہ گئی۔ میں ان دنوں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا اور نیاز صاحب کو پڑھے بغیر ان کا ایسا جذباتی معتقد بن گیا۔ اپنے نام کے آگے نیازی لکھنے لگا۔ اور اپنے نیازی بننے کی اطلاع بذریعہ خط علامہ نیاز فتح پوری کو بھی دی۔ میرے بزرگوں کا خیال تھا کہ نیاز جیسا عظیم اور عدیم الفرصت ادیب ساتویں جماعت کے ایک لڑکے کے خط کا جواب کیا دے گا۔؟

لیکن دوسرے ہی ہفتے جب بالکل غیر متوقع طور پر نیاز صاحب کا مکتوب میرے نام موصول ہوا تو ہمارے گھر میں جیسے جشن منایا گیا۔

نیاز صاحب نے مختصر سے مکتوب میں مجھے نصیحت فرمائی تھی۔

"نیازی نہ بنو۔ بننا ہی ہے تو نیاز بنو۔"

"اپنے نام کے آگے سے نیازی کو فوراً ہٹادو"

ان چند سطروں کا بہت گہرا مفہوم برسوں بعد میری سمجھ میں آیا کہ نیاز صاحب نے مجھے یہ نصیحت کی تھی۔

"دوسرے کی بیساکھی کے سہارے چلنے کے بجائے خود اپنے پیروں سے چلو یعنی خود کچھ بن کے دکھاؤ"۔

پھر میں نے بھی ایک عہد کیا۔

"نیاز بننا تو ناممکن ہے لیکن نگار میں چھپنا تو ناممکن نہیں"۔

میں پورے شعور اور ارادے کے ساتھ اپنے آپ کو نگار کے لئے تیار کرتا رہا۔ حیدرآباد دکن سے علیگڈھ تک میرے راستے کی ایک منزل نگار بھی تھا۔

علیگڈھ کی طالب علمی کے دوران میں نے دو طنزیہ مضامین لکھے۔ جن کے عنوان تھے۔ "اُونچی ایڑی کی گرگابی اور کلیاں"۔ اُونچی ایڑی کی گرگابی برطانوی سامراج کا ایک سمبل تھی، جس کی ایڑی پھانس کی طرح ہندوستان کے دل میں چبھی اور کلیاں۔ آنے والی نسل کا ایک نوکیلا کٹیلا طنزیہ مطالعہ تھا۔

میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دونوں مضامین نیاز صاحب کو بھجوا دیئے۔ میرے ساتھی طالب علم میرا مذاق اڑاتے تھے کہ نیاز صاحب کے گھر میں ردّی کی ٹوکریاں بہت ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو میرے تصوّر میں بھی ردّی کی ٹوکری ہی زیادہ نمایاں تھی۔ لیکن میری خوشی اور میری حیرت نے اس دن آسمان کے کناروں کو چھو لیا۔

جس دن نیاز صاحب کا مکتوب گرامی مجھے موصول ہوا کہ

"تمہارے دونوں مضامین مجھے پسند آئے ہیں انہیں شائع کردوں گا۔ تمہاری تحریر میں مجھے ایک نیا پن محسوس ہوا اسی طرح لکھتے رہو اچھا لکھنے لگو گے۔ اسی طرح لکھتے رہو اور بلا تکلف مجھے بھیجتے رہو۔"

نیاز جیسے بہت بڑے آدمی کی حوصلہ افزائی سے بڑا انسپریشن اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ نیاز صاحب کا یہ خط گویا میری ادبی زندگی کی کتاب کا دیباچہ ہے پیش لفظ ہے اور اسی کے بعد سے میری ادبی زندگی کی کتاب کے اوراق کھلتے چلے جاتے ہیں۔

میرا ایک افسانہ "رشتہ" ساقی میں چھپ چکا تھا۔ اور دوسرے مہینے نگار میں میرا مضمون "کلیاں" چھپ گیا تھا۔

میرے قدم بھلا کاہے کو زمین پر ٹکتے۔!

وہ دن اور آج کا دن میرے میکدۂ حیات میں شہرت کی شراب ناب کی کوئی کمی نہیں ہے بلکہ اب تو میں شہرت کی اس شراب سے خوب جھک گیا ہوں بہت تھک گیا ہوں۔

ہندوستان میں نیاز صاحب سے مجھے کبھی نیاز حاصل نہ ہوا البتہ پاکستان میں صرف تین بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ پہلی بار

میں نے انہیں اخبار جنگ کے دفتر میں حضرت اطہر نفیس کے پاس بیٹھے اپنے مضامین کے معاوضے کے کرنسی نوٹ گنتے دیکھا۔ میں حاضر خدمت ہوا تو انہوں نے بڑے پیار سے گلے سے لگا لیا اور بڑے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

"اچھا تو تم ہو۔ اچھا لکھتے ہو۔ مگر لمبے بہت ہو"۔

اس کے فوراً بعد انہوں نے کہا۔

"اچھا جاؤ میرے لئے کوئی سواری لے آؤ"۔

میں ایک بے بی ٹیکسی لے آیا تو بولے۔

"اب کبھی میرے گھر آؤ۔ پھر تم سے خوب باتیں ہوں گی"۔

دوسری بار جناب جمیل جالبی کے گھر کوئی دعوت تھی، نیاز صاحب نے مجھے دیکھتے ہی ڈانٹا۔

"تم مجھ سے ملنے نہیں آتے۔؟"

مجھ سے کوئی جواب نہ بڑا تو مسکرا کر بولے۔

"نہ آؤ۔ اپنا نقصان کرو گے۔ ہمارا کیا جائے گا"۔

تیسری بار کراچی میں نظر حیدر آبادی اور ظریف جبلپوری کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ تھا۔ نیاز صاحب جو غالباً رات جلد سونے کے عادی تھے۔ اس جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ رات نو بجے تک جلسہ شروع نہ ہوا تو مجھے بلایا اور تلخ سے لہجے میں بولے۔

"جب موت وقت کی پابند ہوتی ہے تو تعزیتی جلسے وقت

پر کیوں نہیں ہوتے!"

یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

"ہم چلے۔ سونے جارہے ہیں۔"

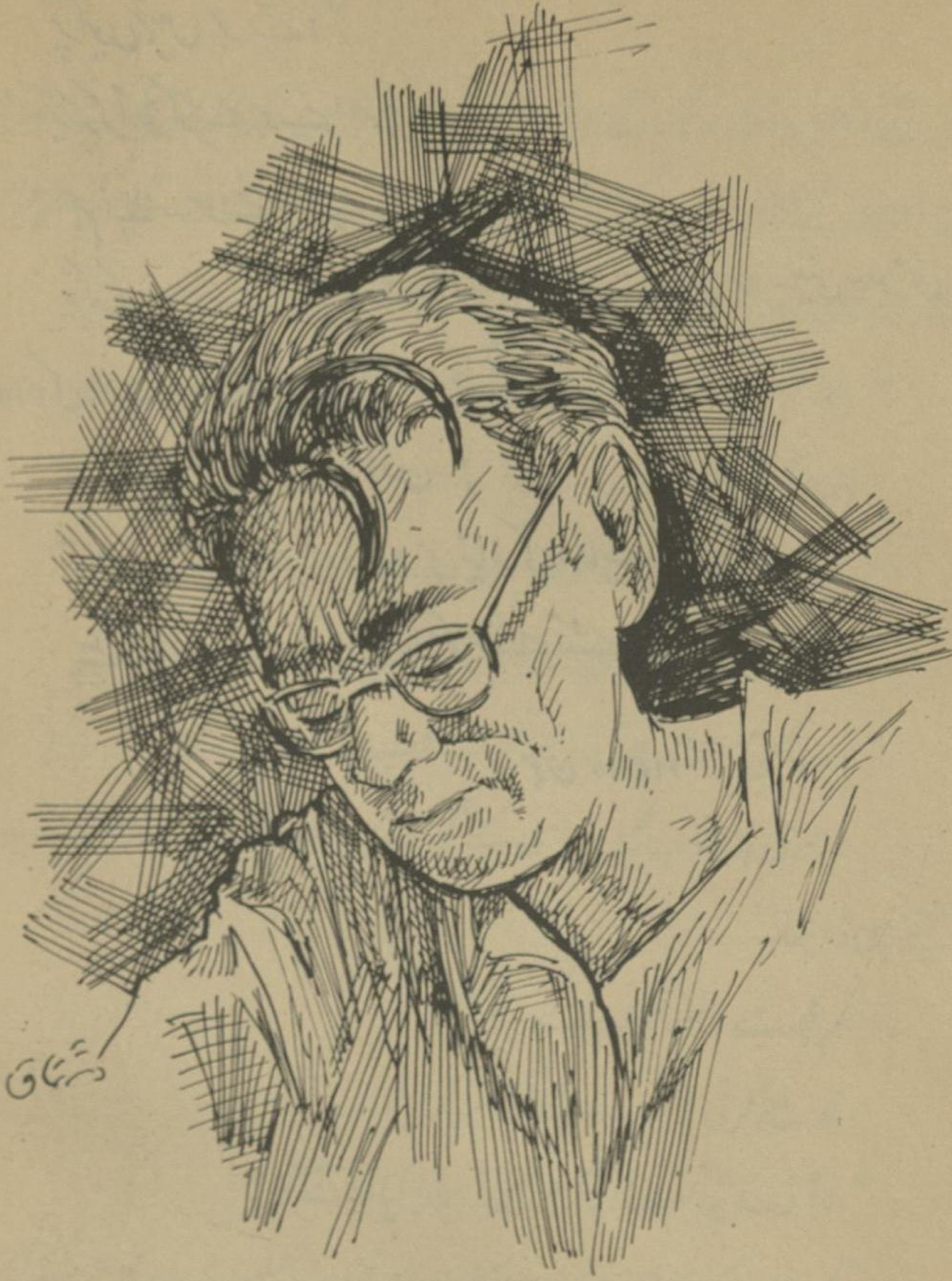
یہ کہہ کر وہ سونے تو چلے گئے۔ لیکن سوئے بہت دنوں بعد۔ یعنی ۲۴ر مئی ۱۹۶۶ء کی رات وہ ایسے سوئے کہ پھر نہ اُٹھے۔

اب رہا ان کی وفات کا دن۔!

تو جو دن دُنیا کا آخری دن وہی نیاز کی وفات کا دن۔

پہلے دُنیا مرے تو پھر کہیں نیاز کو موت آئے۔

۸ر جون ۱۹۶۸ء



سعادت حسن منٹو

وہ دن ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء کا دن تھا۔

۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء کے دن سعادت حسن منٹو کا گوشت ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔

منٹو غلط زمانے میں پیدا ہوا اور صحیح وقت پر اس دُنیا سے چلا گیا۔ موت اسے صحیح وقت پر اس دُنیا سے اُٹھالے گی۔ اگر اُس کی موت اس پر یہ احسان نہ کرتی تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے پیچھے اس قدر وسیع و عریض ہر دلعزیزی اور اتنا چمکیلا نام نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

منٹو جب ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تو اس نے اپنے نام

کو چاندی کے سکّے کی طرح استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ چاندی کا سکّہ ادب کے بازار میں بڑی تیزی سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں آتا جاتا رہا۔ اس گردش کی وجہ سے اس سکّے پر لوگوں کے ہاتھوں کے پسینے اور میل کی تہیں چڑھتی جا رہی تھی۔ اس پر زنگ لگتا جا رہا تھا۔ اس کی چمک مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ اگر اس چاندی کے سکّے کی گردش اور چند سال اسی طرح جاری رہتی تو اندیشہ تھا کہ منٹو کا نام ایک کھوٹا سکہ بن جاتا جو ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں فن کار کے مُردہ جسم پر قیمتی سے قیمتی چڑھاوا نظر آتا ہے لیکن اس کے زندہ جسم کی ہتھیلی پر کوئی ایک دھیلہ بھی نہیں رکھتا۔ اسی لئے بہت بڑا منٹو بھی اپنے بہت بڑے نام کی دکان کھولنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جہاں بیٹھ کر وہ اتنے بڑے نام کے پندرہ بیس پچیس اور پچاس روپے کرایہ پر اپنا نام بیچا کرتا تھا اور کثرتِ استعمال کے باعث اس کا نام روز بروز از کار رفتہ ہوتا جا رہا تھا۔

غالباً موت بھی منٹو کی بڑی مداح اور اس کے افسانوں کی بڑی عاشق تھی۔ اسے غالباً منٹو کی یہ حرکت بُری لگی اور وہ اس وقت اسے اپنے ساتھ لے گئی جب کہ اس کے نام میں ابھی بہت چمک دمک باقی تھی۔

منٹو کے اس دُنیا سے چلے جانے کی خبر سُن کر سب کی طرح مجھے بھی بڑا دکھ ہوا لیکن تعجب قطعاً نہیں ہوا۔

منٹو سے میری آخری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی جب وہ فحش نگاری کے

ایک مقدمے میں ماخوذ لاہور سے کراچی آیا تھا۔ اس وقت اسے دیکھ کر میں یہ سمجھ گیا تھا کہ اب اس کا چل چلاؤ ہے اور مجھے کسی دن بھی اس خبر کو سننے کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ منٹو جنت میں کسی حور لالہ رُخ کے کاشانے یا طہورہ کے میکدے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے کہ

"کھول دو"

میں یہ تو دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں منٹو کا بڑا قریبی اور گہرا دوست ہوں اور نہ ہی میرا شمار منٹو کی قبر کے نئے نئے ان گنت مجاوروں میں کیا جا سکتا ہے، البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ منٹو کی موت سے دو سال پہلے جب مجھے روزگار کی تلاش میں لاہور جانا پڑا تو شاید ہی کوئی شام ایسی آتی جب منٹو نصیر انور، احمد راہی، منیر نیازی اے حمید اور مجھے ساتھ لے کر کھلی چھت والے تانگے میں سوار لاہور کی زندگی سے بھرپور سڑکوں پر نہ گھومتا رہا ہو۔

اس کی بیشتر شامیں اس ہوٹل کے کمرے میں گزرتیں جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ منٹو پر ان دنوں اس کے گھر والوں کی طرف سے پینے پر بڑی سخت پابندیاں عائد تھیں اس لئے اس نے میرے کمرے کو جائے پناہ اور شراب خانہ بنا رکھا تھا۔ ان دنوں روز روز کی ملاقات اور درمیان میں شراب کی ایک بوتل کے باعث اس سے میری خطرناک اور شرمناک حد تک بھی بے تکلفی ہو گئی تھی یعنی ان ملاقاتوں میں بعض ایسے بھی مواقع آئے جب میں نے منٹو کو دیکھ کر یوں بھی محسوس کیا ہے کہ اس کے جسم پر تو کپڑے

ہیں لیکن اس کا سارا وجود الف ننگا ہے۔

منٹو سے مجھے جو قربت حاصل رہا ہے اسے گہری دوستی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس تعلق کو جان پہچان کی وہ آخری منزل قرار دیا جا سکتا ہے جہاں سے دوستی کا آغاز ہوتا ہے۔ منٹو سے ابھی دوستی کا آغاز ہوا ہی تھا کہ منٹو اسی طرح اُٹھ کر چلا گیا جس طرح کبھی کبھی وہ آتا اور کمرے کے دروازے پر کھڑے کھڑے کہتا:۔

"میں آگیا ہوں اور اب جا رہا ہوں میں جانے کے لئے ہی آیا تھا۔"

اس نے غالباً مجھ دوستی گویا داغ مفارقت دینے کے لئے ہی کی تھی۔ لیکن میری اس سے دوستی جتنی مختصر تھی اتنی ہی پُرخلوص تھی؛ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جب بھی مجھ سے ملنے آتا صرف سعادت حسن کی طرح آتا اور منٹو کو کہیں باہر ہی چھوڑ کر آتا۔ اور میں بھی جب بھی اس سے ملا۔ جلیس کی حیثیت سے نہیں بلکہ ابراہیم حسین کی طرح ملا۔ مجھے یاد ہے کہ منٹو سے بے شمار ملاقاتوں کے دوران اس سے ادبی مسائل پر صرف ایک بار ایسی زبردست بحث ہوئی کہ ہم دونوں لڑ پڑے اور فوراً بغلگیر ہو گئے۔

ان دنوں منٹو کی ایک کتاب مشہور فلمسار ملکہ ترنم نور جہاں سے متعلق شائع ہوئی تھی۔ "نور جہاں سرور جان" اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں نے منٹو سے کہا۔

"تمہاری یہ کتاب "نور جہاں سرور جاں" محض بکواس ہے

اب تم ہتک، بابو گوپی ناتھ، موذیل اور کھول دو جیسے لافانی
افسانے کیوں نہیں لکھتے۔ فلمساروں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"
منٹو نے کہا:۔

"یار اب گوپی ناتھ کے مقابلے میں فلمسار آسانی سے بک
جاتے ہیں۔"

میں نے جل کر کہا:۔

"فلمساروں سے زیادہ تو تم بکتے ہو سعادت۔ مجھے یہ دیکھ کر
دُکھ ہوتا ہے کہ تم اب ادب کی شاہراہ پر خوشیا۔ سوگندھی
گوپی ناتھ اور موذیل جیسے یادگار مجسمے نصب کرنے کے بجائے
پُرانے بغداد کے بردہ فروش تاجر کی طرح آوازیں لگاتے ہوئے
اپنے دوستوں کے اجسام سربازار نیلام کر رہے ہو۔"

منٹو اس ریمارک پر ایک دم جھلا اٹھا۔ یہ اس کی عادت تھی جب اس کے
سامنے اس کی تحریر کی بُرائی کی جاتی تو وہ ایک دم غصے میں آجاتا تھا۔ اور لڑنے مرنے
کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ پھر اپنے آپ میں لوٹ آتا اور کہتا:۔

"ادب وِدب سب بکواس ہے۔ انسان بڑی چیز ہے
اُٹھاؤ گلاس اور مارو جھک۔"

منٹو سے قریب رہنے کے دوران میں نے بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس

کیا کہ وہ غلط یا صحیح قسم کے احساس برتری میں مبتلا تھا۔ وہ ہمیشہ اُٹھتے، چلتے پھرتے اور لکھتے کوئی ایسی بات کہنا اور لکھنا اور کوئی ایسی حرکت کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ جس سے اس کے اردگرد کے لوگ ایک دم چونک پڑیں اور اس کو اپنے سے مختلف اعلیٰ اور افضل تصور کریں۔ اس عادت کے باعث پیدا ہونے والے سینکڑوں واقعے ہیں لیکن ایک واقعہ مجھے بڑا یاد آتا ہے۔

میں منٹو کے ساتھ جب بھی لاہور کی سڑکوں پر نکلتا تھا تو وہ تانگے میں ہمیشہ آگے کوچوان کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ اور میں، نصیر انور، احمد راہی یا منیر نیازی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے تھے۔ میں نے اس کے آگے یا پیچھے بیٹھنے کی بات کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ ویسے بھی بلاشبہ منٹو ہم سب سے زیادہ بڑا لکھنے والا تھا۔ لیکن ایک دن جب منٹو کافی چپکا ہوا تھا۔ مجھ سے بولا۔

"میں نہ صرف افسانہ نگاری میں تم سب سے آگے رہتا ہوں بلکہ لاہور کی سڑکوں پر بھی تم سب سے آگے ہی رہتا ہوں۔"

بات سچی تھی اس لئے کسی کو بھی ناگوار نہیں گزری لیکن مجھے ایک شرارت سوجھی، راستے میں ایک جگہ منٹو ایک کام سے تانگے سے اُترا تو میں فوراً اگلی نشست پر جا بیٹھا۔ منٹو جب کام سے فارغ ہو کر تانگے کے پاس آیا اور مجھے اپنی سیٹ پر بیٹھا دیکھا تو بولا :-

"تم میری جگہ پر کیسے بیٹھ گئے۔ جاؤ پیچھے جا کر بیٹھو۔"

میں نے کہا:۔

"اب تم پیچھے بیٹھو۔ میں تو نہیں بیٹھوں گا"

منٹو کو بڑا غصہ آیا لیکن میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ میں ہرگز وہاں سے نہیں ہٹوں گا۔ بڑی دیر تک ہم دونوں میں بڑی جھک جھک بک بک ہوتی رہی بالآخر منٹو نے ایک دوسرا تانگہ لیا۔ اور اس میں کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا اور کوچوان سے بولا:۔

"اس تانگے سے آگے آگے چلو"

جب اس کا تانگہ ہمارے تانگے سے آگے نکل گیا تو وہ بڑا خوش ہوا۔ اس کا طفل لاشعور کھل کھلا کر ہنس پڑا تھا اور وہ بڑے فاتحانہ انداز میں پلٹ پلٹ کر مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتا تھا۔

منٹو کے کردار کے بارے میں بے شمار لوگوں کو جو اسے شخصی طور پر نہیں جانتے تھے۔ اس کی تحریروں کے باعث بڑی غلط فہمی ہے کہ وہ بڑا غلط قسم کا شرابی، بے حد آوارہ عورتوں کا رسیا اور بڑا غلیظ لباس انسان ہے۔ منٹو سے ملنے سے پہلے میرا تصور بھی کچھ کچھ ایسا ہی تھا۔ لیکن جب میں منٹو سے ملا اور ملتا رہا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے منٹو دلدل کا کنول ہے۔

وہ سچ مچ بہت شراب پیتا تھا۔ کبھی کبھی جب آسمان پر خوب بادل چھائے ہوتے ہوں اور مینہ جھما جھم برس رہا ہو تو پھر دن شام اور رات کو آہستہ آہستہ شراب کی خالی بوتلوں میں بھرتا رہتا تھا۔

شراب کی بوتلوں کے علاوہ اس کی کہانیوں میں اکثر و بیشتر آوارہ اور ننگی عورتیں نظر آتی ہیں فحش گالیوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ اس کا افسانہ "اس بازار" کا ایک ایسا غلیظ کمرہ نظر آتا ہے۔ جہاں ایک گندے بستر پر کوئی مجبور عورت بے حجاب لیٹی ہے اور کوئی مرد شرابور ہے۔ میز پر شراب کی بوتل کھلی پڑی ہے سگرٹوں کا دھواں پھیلا ہوا ہے۔ اور کمرے میں دھما چوکڑی سی مچی ہوئی ہے۔ لیکن منٹو کے افسانے سے باہر لاہور کی ہال روڈ کے عقب میں واقع لکشمی فیشن کے کونے کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا ہے تو اندر سے وہ منٹو باہر نکلتا تھا جو بے حد صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ہوتا تھا۔ میں نے کسی دن بھی منٹو کے اُجلے لباس پر میل کچیل کا ہلکا سا دھبہ تک کبھی نہیں دیکھا۔ وہ اچھے فرنیچر سے آراستہ مکان میں رہتا تھا۔ ایک بے حد شریف بیوی کا وفادار شوہر اور تین پیاری پیاری ننھی ننھی بچیوں کا نہایت مشفق باپ تھا۔ اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تو وہ یہ تک گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے کے بجائے فرش پر جھاڑ دے۔ ایک بار مجھ سے سگریٹ کی راکھ فرش پر گر پڑی تو منٹو نے میرے ہاتھ میں ایک جھاڑو پکڑا دی کہ چلو یہ فرش صاف کرو۔

میں سمجھتا ہوں کہ منٹو کی شخصی اور ذہنی زندگی میں یہ تضاد ہی منٹو کی تخلیق کا باعث ہے شخصی اور ذہنی زندگی کے ٹکراؤ ہی سے سعادت حسن میں ایک منٹو نے جنم لیا تھا۔

منٹو کے لئے دُنیا میں شاید سب سے زیادہ پیاری چیز بوتل ہی تھی، اور میرا یہ خیال بھی صحیح ہے کہ زندگی خود بھی اس کے لئے شراب کی ایک بوتل تھی، جسے منٹو بڑے مزے لے لے کر پیتا تھا اور اُس کے نشے کو کہانیوں کی شکل میں اپنے ارگرد بکھیرتا رہا۔ لیکن زندگی کے بارے میں تلون مزاج اور بے حد عجلت پسند منٹو ڈسٹلری کی شراب کی طرح زندگی کی شراب کو بھی تیز تیز جلدی جلدی پیتا گیا۔ اور ساٹھ ستر اسی نوے اور شاید ایک سو سال تک نشہ دینے والی بوتل اس نے صرف ۴۳ سال میں ختم کردی۔ اور منٹو کے رشتہ داروں اور عقیدت مندوں نے اس خالی بوتل کو کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر پھینکنے کے بجائے احتراماً میانی صاحب کے قبرستان میں مٹی کے ایک ڈھیر تلے چھپا دیا۔ بوتل تو چھپ گئی لیکن اس کا نشہ جس کا نام منٹو ہے۔ ادب کی دُنیا پر طاری ہے اور ہمیشہ چھایا رہے گا۔

منٹو جب بھی شراب پیتا تھا تو یہ دعویٰ ضرور کرتا تھا کہ میں شراب پیتا ہوں۔ شراب مجھے نہیں پی سکتی — منٹو کا یہ دعویٰ غلط تھا۔ شراب منٹو کو آہستہ آہستہ پیتی رہی۔ اس کا خاکی جسم آہستہ آہستہ شراب میں تحلیل ہوتا رہا۔ بالآخر وہ دن بھی آگیا جب اس کا خاکی جسم بالکل ہی تحلیل ہوگیا اور صرف شراب باقی رہ گئی۔

اب منٹو اتنی دور چلا گیا ہے کہ اس کا واپس آنا ناممکن ہے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ زمین پر واپس آنے کے لئے تڑپ رہا ہوگا۔

اسے زمین سے عشق تھا۔

کبھی کبھی میں بھی اس کے لئے تڑپ اُٹھتا ہوں۔ اور دل مچل کر مجھے اُکسانے لگتا ہے۔

"اٹھاؤ بوتل اور چلو منٹو کے پاس۔"



اسرار الحق مجاز

ایک نامکمل غزل

انسان کی سب سے بڑی عاشق موت ہے۔

جس دن انسان اس دنیا میں آتا ہے موت ٹھیک اسی دن سے اس کے قربِ وصال کے لئے بے قرار ہو جاتی ہے۔ انسان موت کے جنونِ محبت سے ناآشنا حسینۂ زندگی کے جمالِ جہاں تاب کا دیوانہ ہو جاتا ہے اور پھر پہلے ہی دن سے انسان کیلئے موت اور زندگی میں رقیبانہ پیکار شروع ہو جاتی ہے۔

موت انسان سے جتنا والہانہ پیار کرتی ہے زندگی انسان سے اتنی ہی بے نیاز اور بے پرواہ ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے جلد یا بدیر موت ہی کا عشق شاد کام اور سرخ رو ہو جاتا ہے۔ پھر وفا ناآشنا زندگی اپنے محبوب کو پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی اور

موت بڑے فاتحانہ انداز میں اپنی محبت کی جیت سے اپنا دامن بھر لیتی ہے۔

بعض محبوب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا فراق موت کو تا دیر گوارا ہی نہیں ہوتا اور موت ان کی زندگی کو جوانی کی بھری پُری شاہراہ پر ہی لوٹ لیتی ہے۔

موت کا ایسا ہی ایک منظورِ نظر محبوب اسرار الحق مجاز بھی تھا۔

زندگی کا راستہ سو سوا سو برس کی منزلوں تک تو ضرور جاتا ہے لیکن زندگی کے راستے کی ان آخری منزلوں تک وہی خوش نصیب یا بدنصیب جا سکتے ہیں جنہیں موت کے پیار کی حدت میسّر نہیں آتی۔

مجاز جیسے سادہ و معصوم محبوب سامنے ہوں تو موت پھر کسے اور کیوں دیکھے؟

اگر مجاز میں موت کے لئے کوئی ادائے دلبری نہ ہوتی تو مجاز بھی زندگی کے راستے پر اب تک چل رہا ہوتا۔

عصمت چغتائی نے بیان کیا تھا۔

"علی گڑھ گرلز کالج کی لڑکیاں مجاز کے لئے قرعہ نکالتی ہیں"۔

اب سوچنا پڑتا ہے کہ موت بھی تو کہیں ان لڑکیوں میں نہیں تھی۔!؟

مجاز سے موت کی محبت جیسے ہر لڑکی کی محبت سے زیادہ سچّی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کی زندگی کسی شہنازِ لالہ رُخ کی زُلف کی طرح لمبی نہیں، اس کی زندگی میں جام و مینا کی کھنک تو ہے لیکن کسی بھی ثریا بخت، زہرہ جبیں کی چوڑیوں کی چھنک نہیں، اس کی زندگی میں مے خانے کا بے ہنگم شور تو بہت ہے لیکن نہ تو کسی سیم تن کے دل کی میٹھی

دھڑکن ہے اور نہ کسی ماہ وش کے چور قدموں کی ہلکی چاپ۔

اس کی زندگی میں میکدے کی رات کا اندھیرا تو ہے لیکن محبوب کے چہرے کا چاند نہیں ہے۔

اگر مجاز کی زندگی میں اس نگارِ دل آرا کے چہرے کی چاندنی چٹکی ہوتی جس کے بارے میں مجاز نے ڈھکے چھپے اعتراف کیا تھا کہ:۔

ع میں جس دُنیا میں رہتا ہوں وہ اس دُنیا کی عورت ہے۔

اگر اسی عورت کی زلفوں کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں پھیلی ہوتی اور اس کے جسم کا لذت آگیں لمس اس کی زندگی میں مٹھاس گھول دیتا تو مجاز اس راستے پر کبھی نہ بھٹکتا جس کے ایک موڑ پر موت اس کی تاک میں چھپی بیٹھی تھی۔

جیسے ہی مجاز میکدے کے راستے پر بھٹک نکلا تو موت کی خادمہ شراب نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں موت کی محبت کا جام تھما دیا۔

یہ جام کیا ہاتھ آیا کہ مجاز اپنے والدین اپنے بھائی بہنوں، اپنے یاروں اور سارے پیاروں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ پھر سب ہی مجاز کے لئے ہاتھ ملتے رہ گئے اور اب ان ہاتھوں میں اس کے لئے دعائے مغفرت کے سوائے کچھ بھی نہیں رہا ہے۔

کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کون مایوسی تھی۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیسی تشنہ کامی تھی، کسی نے نہیں محسوس کیا کہ وہ کون غم تھا کہ جس نے شراب کا وہ جام مجاز کے لبوں سے لگا دیا کہ مجاز نیم جان ہو کر اپنے ہی پوست و استخوان کے کھڈ میں آخری

سانس تک بیہوش پڑا رہا۔

میں تو مجاز کے پوست و استخوان جسم کو بھی ایک قبر ہی سمجھتا ہوں۔ جس میں مجاز جیتے جی دفن رہا۔

پھر مجاز پیتا گیا۔ مرتا گیا۔ جینے کے لئے پیتا رہا۔ پینے کے لئے مرتا رہا۔ مرتا گیا پیتا گیا۔ پیتا گیا مرتا گیا اور بالآخر وہ دسمبر کی رات ہمیشہ کے لئے مر گیا۔

ادھر مجاز کے ہاتھوں میں جام آیا ادھر مجاز، مجاز نہ رہا۔ حسن عسکری نے مجاز کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ارے۔ یہ تو اُردو ادب کا ایک افسانہ ہے۔!"

مجاز کے ہمدم دیرینہ سید سبط حسن نے مجاز کو دیکھا تو ٹھنڈی آہ بھر کر بڑے کرب آمیز لہجے میں بولے

"یہ تو غزل ہے — بڑی بے ربط اور اکھڑی اکھڑی سی۔ نہ مصرعے موزوں نہ زمین شاداب، نہ ردیفیں شگفتہ نہ قافیوں میں آہنگ، پریشان نظری اور پریشان خیالی اس کے ایک ایک لفظ میں پوشیدہ — البتہ محبت اور سرشاری کی ایک فضا ہے جو اس غزل پر بھرپور چھائی ہوئی ہے۔ بلا کا جذبہ قیامت کی نغمگی تھی اس غزل میں اہل ذوق اس درد بھری غزل کو گاتے گنگناتے رہے۔ اہل ہوس اس سے اپنی تفریح کا سامان فراہم کرتے رہے۔

اس کی خوش گفتاریوں سے اپنی محفلیں سجاتے رہے۔

افسوس کہ یہ غزل نا تمام رہی۔ ایسی غزلوں کا یہی انجام ہوتا ہے میرے دوست۔ شیلی، کیٹس، بائرن، پشکن، لرمان توف، لورکا، چیسٹرٹن، مایکافسکی، گوگول، چیخوف، مہدی افادی، اختر شیرانی، میراجی، منٹو اور مجاز ..... بڑی لمبی فہرست ہے ان نامتمام غزلوں کی ......"

میں اپنے آپ کو ان خوش نصیبوں میں سمجھتا ہوں جنہیں کچھ عرصہ مجاز کی رفاقت کی نعمت حاصل رہی ہے۔ حیدر آباد دکن اور بمبئی کے بہت سے

"مجاز دنوں اور مجاز راتوں"

کی یاد کے علاوہ خاص طور پر مجھے کراچی کی وہ مہکتی بہکتی راتیں بھی یاد آ رہی ہیں جن کی زلفیں مجاز کے شانوں پر پریشان ہو گئی تھیں۔

مجاز جیسے اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں کو الوداع کہنے پاکستان آیا تھا۔ مشاعرہ تو جیسے محض بہانہ تھا۔

مشاعرے کے اشتہارات میں، میں نے مجاز کا نام تو پڑھا تھا لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ لکھنؤ کی راتوں کا یہ جاں نثار عاشق لکھنؤ کو ایک رات کے لئے بھی آزارِ فراق میں مبتلا کر سکتا ہے! لیکن دوسرے ہی دن اچانک ٹیلیفون کی مانوس آواز گونجی۔

"میں مجاز بول رہا ہوں۔ آؤ اور مجھے ساتھ لے جاؤ"

میں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا :-

"آپ کہاں ٹھیرے ہیں۔ پتہ بتایئے تو میں آؤں"

مجاز نے کہا :-

"میں پہلی بار تو کراچی آیا ہوں، پتہ وتہ کچھ نہیں جانتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ جہاں میں ٹھیرا ہوں اس کے آگے صرف آب و ہوا ہے۔"

بعد کو پتہ چلا کہ مجاز کراچی کے مشہور ساحل کیماڑی پر واقع میولز مینشن میں اس وقت کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈان محمد احمد زبیری صاحب کے گھر مقیم ہیں ظاہر ہے کہ کیماڑی کے آگے آب و ہوا کے سوائے اور ہے ہی کیا۔!

اس رات مجاز کراچی کے ساحل سمندر سے اُٹھ آتے اور اندرون کراچی جیسے شراب ناب کے سمندر میں گر پڑے۔

اور اب تو ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں نہ آب ہے، نہ ہوا ہے۔ نہ شراب ہے۔

مجاز نے اپنے پیچھے اُردو شاعری میں ایک نئی آواز اور دُنیا کی تقویم میں ایک دن چھوڑا ہے۔ بس یہی ہیں اس کے سوگوار پسماندگان یعنی

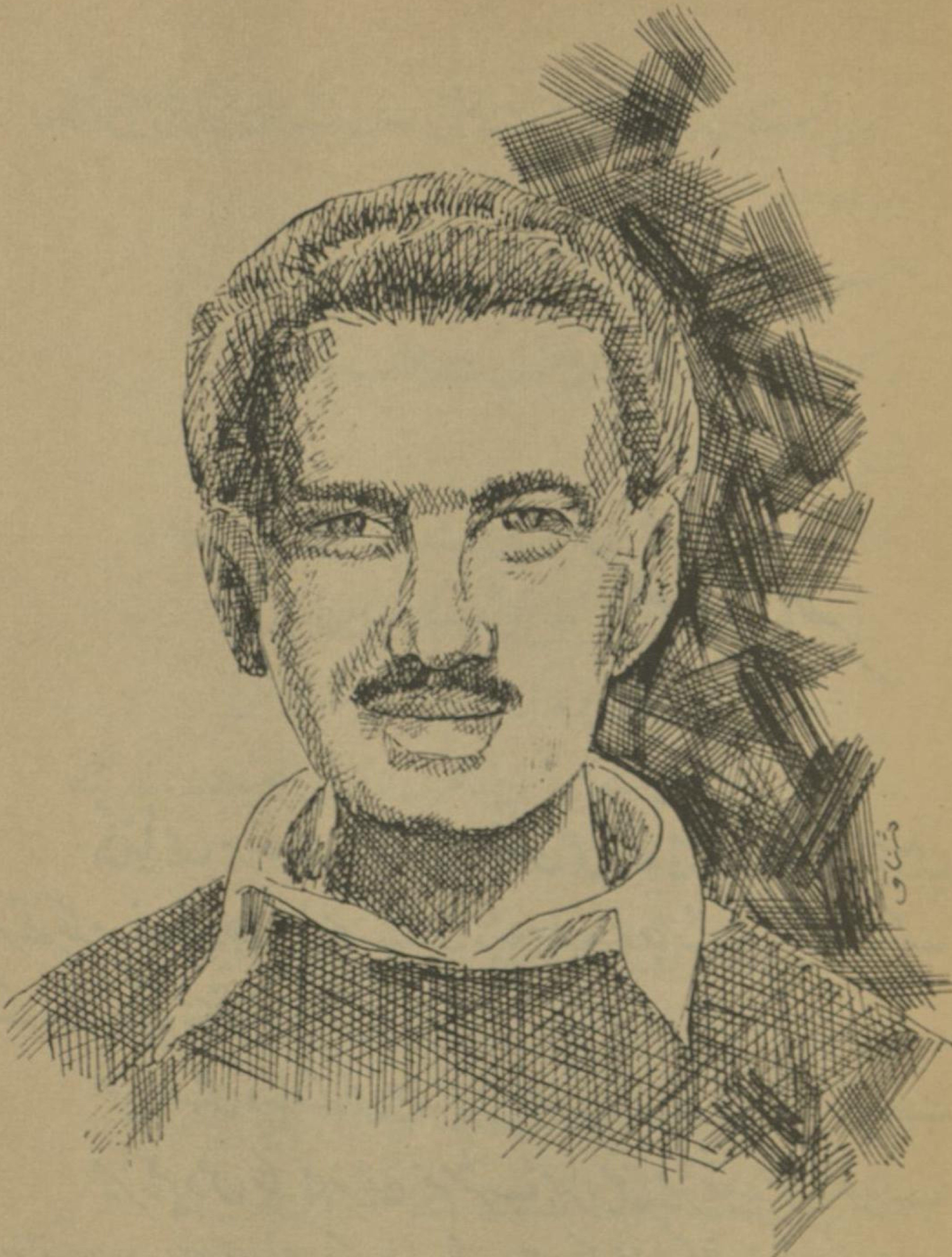
آہنگ ــــ اور ــــ پانچ دسمبر کا دن

پانچ دسمبر کا دن رہتی دُنیا تک مجاز ہی کا دن رہے گا۔ اس دن مجاز کے

سوائے کوئی یاد ہی نہیں آتا۔

پانچ دسمبر مجاز کا مقبرہ ہے۔ اور میں رسماً ہر سال پانچ دسمبر کے مزار پر مجازؔ کے لیے یادوں کے گلاب چڑھاتا ہوں، اس دُعا کے ساتھ کہ

ع مہکیں تری تربت کے گلاب اور زیادہ



حسن ناصر

دُنیا میں ہر دَور میں بعض ایسے انسان بھی آتے ہیں، جو پیدا ہو کر نہیں مرتے بلکہ مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں، زندہ جاوید ہو جاتے ہیں، قیامت تک کے لئے جیتے رہتے ہیں۔

حسن ناصر بھی دُنیا کے ان چند خوش نصیب انسانوں میں سے ایک ہے، میرا ہم وطن بلکہ "ہم زمین"، ہم مشرب، میرا رفیق میرا شہید حسن ناصر اب سے تیرہ سال پہلے ۱۳ نومبر کے جہاد پاکستان کو محنت کش انسانوں کی جنّت بنانے کے جہاد کے جرم میں آمریت کے ہاتھوں پاکستان کے محنت کش عوام پر سے ایسا قربان ہوا کہ اس کا نہ کوئی جنازہ اُٹھا نہ اس کا کوئی مزار بنا۔

لیکن پاکستان کے کسی بھی محنت کش انسان کے دل پر آج بھی دستک دے کر آواز دو۔

"حسن ناصر۔ او حسن ناصر"

تو حسن ناصر اس دل کی دھڑکنوں سے جواب دے گا۔

"میں یہاں موجود ہوں"

شاعر شاہد رضوی نے حسن ناصر ہی کے بارے میں تو کہا تھا۔

ے اک آواز امر شہید کی گونجے صدیوں سال
ایک لہو کی بوند گرے تو دھرتی ساری لال

بزرگوارم سید سبط حسن نے بھی حسن ناصر کی لافانی شخصیت کے گلے میں اپنا "آنسو مالا" یوں پہنایا تھا۔

"حسن ناصر کی پُراسرار موت کے راز کو کون افشا کرسکتا ہے۔ حسن ناصر نے قلعہ لاہور کے سیاہ خانہ مصیبت میں جس طرح جان دی اسے کون بتا سکتا ہے۔ اس مرد آہن پر اذیتوں کے کون کون سے ہُنر آزماتے گئے۔ کسے معلوم۔ ہمیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ حسن ناصر کا جنازہ کب اُٹھا اور اس کو کہاں اور کس نے سُپرد خاک کیا۔ مگر وہ جوانی ہی کیا جو بستر مرگ پر دم توڑے! وہ انقلابی ہی کیا جس کا سینہ ظلم کے سفاک تیروں کی آماجگاہ

نہ بنے اور۔

ع کیا لطف جنازہ اُٹھنے کا ہر گام پہ گر ماتم نہ ہوا

حسن ناصر کی ناگہانی موت دورِ ایوبی کا شاید سب سے شرمناک سانحہ ہے ایسا واقعہ کسی جمہوری ملک میں پیش آیا ہوتا تو ہر طرف تہلکہ مچ جاتا۔ اسمبلی میں سوال ہوتے۔ اخباروں میں احتجاجی بیانات چھپتے۔ اعلیٰ پیمانے پر عدالتی تحقیقات ہوتیں اور پھر مجرموں کو ان کی سیہ کاریوں کی قرار واقعی سزا ملتی۔ لیکن ہمارے ملک میں راوی اُلٹا بہتا ہے چنانچہ قاتلوں کی سرزنش کے بجائے انہیں ترقیوں سے نوازا گیا۔ ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ ترقیاں ظالم آمریت کی رسوائیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اور جس شخص کے اشاروں پر یہ ستم توڑے گئے تھے وہ کرسی اقتدار سے بہت بے آبرو ہو کر اُٹھا۔ یہی حشر ان سبھوں کا ہوا جن کے ہاتھ حسن ناصر کے خون سے آلودہ تھے۔ اور حسن ناصر نواب بھی زندہ ہے۔

حسن ناصر میرا "ہم زمین" تھا۔ اس کا خمیر بھی حیدر آباد دکن کی مٹی سے اُٹھا تھا میں نے بھی ارضِ دکن کی آغوش میں آنکھیں کھول کر پہلی بار دُنیا دیکھی ہے۔

حسن ناصر سرزمین دکن کے امیر نوابوں کی فلک بوس بستی "نجارہ ہلز" کے ایک عالیشان محل میں منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا۔

آغاز لڑکپن تک اس نے کبھی ننگی زمین پر ننگا پاؤں نہیں رکھا۔ قیمتی ایرانی قالینوں پر رینگنے والا آیاؤں اور نوکروں کی گودیوں میں مچلنے والا شاندار

کاروں میں امیروں کے بچوں کے لئے مخصوص اسکول جانے والا اکلوتا لاڈلا حسن ناصر۔ جس کے ماں باپ یہ چاہتے تھے کہ وہ برطانیہ امریکہ یا یورپ کی کسی شہرہ آفاق یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرے۔ اور کوئی بہت بڑا سرکاری افسر بن کر کوئی امیر چاند سی بہو گھر لے آتے۔ اور ہمیشہ فلک بوس کوٹھیوں میں مقیم رہے ہمیشہ آسمان کو دیکھتا رہے۔ اس کی نظریں کبھی زمین پر نہ پڑیں۔

مگر۔ صدیوں پہلے ہماری نظروں سے اوجھل گوتم بودھ راج محل سے نکل کر غریب انسانوں کی رہنمائی کے لئے ایک پیپل کے پیڑ تلے جا بیٹھا تھا تو صدیوں بعد ہماری آنکھوں کے سامنے حسن ناصر امیروں کی فلک بوس بستی نجارہ ملز سے اتر کر زمین کی پستیوں میں غریبوں کی جھونپڑوں اور کچے گھروں میں مساواتِ انسانی کے چراغ جلانے کے لئے بھٹکتا رہا۔

اور پھر بالآخر سرزمین ہمالہ میں آمریت کے بھیانک ظلم کدے۔ "قلعہ لاہور" میں حیاتِ جاوداں کا چھلکتا جام پی کر پاکستان سے آسمانوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

حسن ناصر فلک بوس محل سے نیچے زمین پر رینگنے والے غریبوں کی طرف کس طرح آیا۔ اس کے بارے میں حسن ناصر نے خود ایک بار مجھے وہ واقعہ سنایا۔ جس نے اسے محلوں سے نکال کر چھوٹے گھروں میں اور بالآخر آمریت کے ظلم خانے قلعہ لاہور میں پہنچا دیا۔

حسن ناصر نے وہ واقعہ یوں سنایا تھا کہ وہ جب آٹھویں جماعت میں

پڑھتا تھا تو ایک بار اسکول سے گھر آتے ہوئے اس نے راستے میں دیکھا کہ ایک زیر تعمیر عمارت کا ٹھیکیدار ایک غریب مزدور کو ہنٹر سے بُری طرح پیٹ رہا ہے۔ اور غریب مزدور لہولہان درد سے بُری طرح بلبلا رہا ہے۔

حسن ناصر نے فوراً اپنی کار رکوالی۔ اُتر کر اس ظالم ٹھیکیدار سے لپٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے ہنٹر چھین لیا وہ ٹھیکیدار حسن ناصر کے پدر ذی جاہ سے واقف تھا اس لئے اس نے ہاتھ روک لیا۔

حسن ناصر پھر اس زخمی لہولہان مزدور کو اپنی کار میں بٹھا کر اپنی کوٹھی میں لے گیا۔ اس کی والدہ بھی حسن ناصر کی اس رحم دلی سے بہت متاثر ہوئیں، انہوں نے بھی اس مزدور کی مرہم پٹی کی۔ اور حسن ناصر کی پیٹھ ٹھونکی۔

یہ واقعہ حسن ناصر کی زندگی کا موڑ تھا۔ یہیں سے وہ محلوں کا راستہ چھوڑ کر جھونپڑیوں کی طرف مُڑ گیا۔

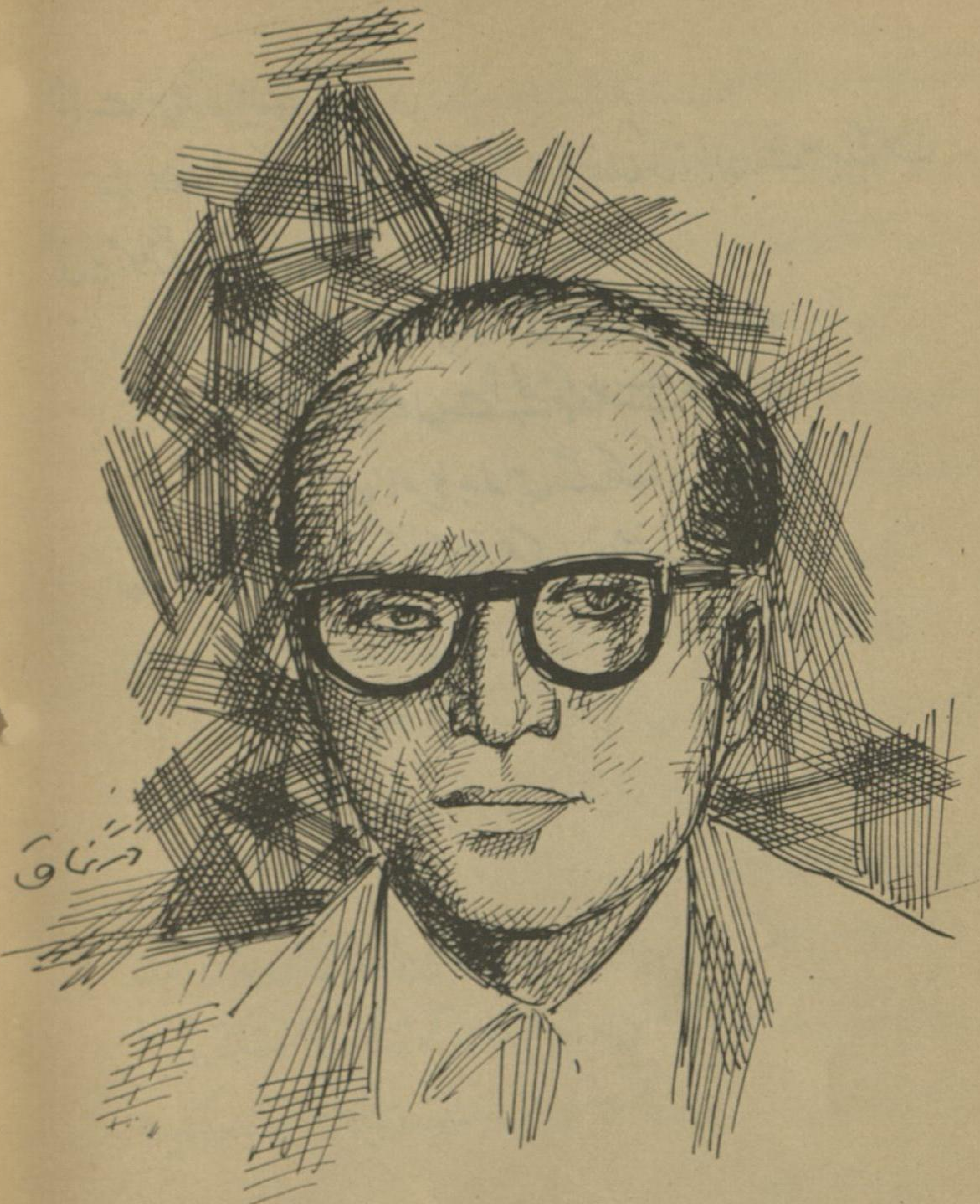
اب حسن ناصر تو اس دُنیا میں نہیں ہے لیکن اب بھی جب کبھی لانڈھی سائٹ یا پاکستان کے کسی بھی صنعتی اور زرعی علاقے میں کوئی محنت کش غریب انسان شہید ہوتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے حسن ناصر ایک بار اور شہید ہوا ہے۔

جب تک زمین پر مساوات انسانی کا راج قائم نہیں ہوتا۔ حسن ناصر کبھی مزدور صابر کے نام سے شہید ہوتا رہے گا۔ تو کبھی مزدور عبدالکریم کے

نام سے امر ہوتا رہے گا۔

اور ظالم کے ہر فائر کے ساتھ محنت کشوں کی زبان سے حبیب جالب کی یہ آواز گونجتی رہے گی کہ

ہم ہیں حسن ناصر کے ساتھی ٹھیک ہمارا رستہ ہے
جو ہم دل والوں سے اُلجھے، جاہ طلب ہے جھوٹا ہے
خون حسن ناصر کا بدلہ لیں گے اک اک قاتل سے
دُور نہیں کر سکتا کوئی ہم کو اپنی منزل سے



مخدوم محی الدین

دُنیا میں چند انسان ایسے بھی آئے ہیں کہ کاتبِ حیات ان کی زندگی کا سرورق تو لکھ دیتا ہے لیکن آخری صفحہ نہیں لکھتا۔ شاید قیامت کے دن کے لئے اٹھا رکھتا ہے۔

مخدوم محی الدین بھی ان چند زندہ جاوید انسانوں میں سے ایک ہیں۔ جن کی زندگی کی کتاب کا پہلا ورق ۱۹۱۰ء میں تحریر کیا گیا۔ ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء تک اس کتاب کے ۲۲۱۳۵ صفحات لکھے گئے۔ اور آخری صفحہ قیامت کی شام دُنیا کی تکمیل کے ساتھ ہی مکمل ہو جائے گا۔

مخدوم محی الدین صاحب میرے ذہنی راہ نما میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کے جگری دوست اور ہر طرح میرے بزرگ تھے۔ خوردی اور بزرگی میں جتنا فاصلہ

ہوتا ہے وہ میرے اور مخدوم صاحب کے درمیان بھی تھا۔ مشرقی تہذیب بالخصوص حیدرآبادی تہذیب میں ایک چھوٹے پر اپنے بڑے کا جتنا احترام لازم ہے۔ میں بھی مخدوم صاحب کا اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ احترام کرتا تھا۔ ان کے آتے ہی کھڑا ہو جانا۔ سر پہ ٹوپی اوڑھ لینا۔ ان کے لئے بازار سے جا کے پان اور سگریٹ لانا۔ ان سے چھپا کر سگریٹ پینا۔ جن دنوں وہ انڈر گراونڈ تھے ان کے کپڑے لانڈری سے دھلوانا اور ان کے خاص خاص پیغام خاص خاص لوگوں تک پہنچانا وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک ایسی خدمات کا تعلق ہے مخدوم صاحب میرے لئے اسم بامسمّیٰ یعنی وہ واقعی میرے مخدوم تھے اور میں واقعی ان کا خادم۔ حالانکہ اپنے غریب ہم وطنوں کے لئے انہوں نے جہاں فرسودہ سماج اور مطلق العنان حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کر رکھا تھا وہاں انہوں نے اپنے ہی چہیتے نام سے بھی بغاوت کر دی تھی، اور یہ واقعی کیسی عجیب بغاوت تھی کہ نام تو "مخدوم" اور اپنے ہر غریب اور مظلوم ہم وطن کے بے دام خادم اور بے تنخواہ خدمت گذار۔

یہاں سے سینکڑوں میل دور جنوب میں سطح مرتفع دکھن میں اودی نیلی گھٹاؤں موسلا دھار بارشوں، ہرے بھرے کھیتوں اور سانولی سلونی شاموں والا میرا وطن حیدرآباد آباد ہے۔ جب کبھی فرصت کے لمحات میں پرانی یادوں کی چاندنی پھیل جاتی ہے تو میں تصور کی آنکھوں سے اپنے ہرے بھرے دیس میں اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے چہرے دیکھا کرتا ہوں، ان موہ بھری مورتوں اور پیاری پیاری صورتوں

میں مجھے مخدوم محی الدین کا وہ پُر وقار چہرہ بھی ضرور نظر آتا تھا جس پر دکن کی مخصوص سانولی شام کا سلونا پن ہمیشہ دمکتا رہتا تھا۔

لیکن ادھر ٹھیک اسی دن سے جس دن سے یہ منحوس خبر آئی ہے کہ مخدوم محی الدین زندگی کی شاہراہ سے بھٹک کر موت کی اوگھٹ گھاٹی میں اتر گئے ہیں اور اب اس راستے پر ان کی حیات جاوداں کا چراغ جل اُٹھا ہے تو میں اسی چراغ کی روشنی میں پھر اپنے پیارے وطن سندر دکن کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ سارے مانوس اور پیارے چہرے صاف صاف نظر آ رہے ہیں۔ صرف مخدوم کا دلاویز چہرہ آنسوؤں میں بار بار ڈوب ڈوب جاتا ہے۔

آنسو ہیں کہ رکتے نہیں، چہرہ ہے کہ دمکتا نہیں۔ عدم کے راستے کا مسافر کبھی رُکتا ہی نہیں تو اس کے لئے آنسو بھلا کیسے رُک سکتے ہیں۔!؟

اب تو مخدوم کا نام مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر پھیل جاتا تھا۔ اب وہی مخدوم کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنسو بن کر اُمڈتا رہے گا۔

اب سے بہت دُور جب میں گلبرگہ ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ دہلی سے بچوں کا ایک رسالہ "پیام تعلیم" شائع ہوا کرتا تھا۔ اس رسالے کے ذریعہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان دُنیا بھر کے بچوں کی دوستی کی ایک تنظیم "پیام برادری" کے نام سے نام سے قائم تھی اور میں اس پیام برادری کی شاخ گلبرگہ کا صدر تھا۔ اس کے ایک سالانہ جلسہ کی تقریب کے لئے ہم کسی بڑی اور مشہور شخصیت کو مدعو کرنا چاہتے تھے،

اُن دنوں ساری ریاست حیدرآباد میں ایک نئے نام کی شہرت کا طوطی بڑی خوش الحانی سے چہک رہا تھا وہ نام تھا — مخدوم محی الدین۔

میں نے اپنے دوستوں عثمان صحرائی مرحوم نوح فاروقی عبدالرحیم فضل اور نیار گلبرگوی کے مشورے سے مخدوم محی الدین کو اس تقریب کی صدارت کے لئے مدعو کیا۔ مخدوم نے نہ صرف اس تقریب کی صدارت قبول کر لی بلکہ اس دور کے ایک مشہور اور مقبول شاعر صاحب زادہ محمد علی خاں میکش مرحوم کو بھی اپنے ساتھ گلبرگہ لے آئے۔ پیام برادری کی وہ تقریب نہایت کامیاب رہی۔ گلبرگہ میں ہلچل سی مچ گئی۔

جمادات میں پارس پتھر

انسانوں میں مخدوم محی الدین

جسے چھولیں وہی سونا۔ مخدوم گلبرگہ سے تو چلے گئے لیکن اپنے پیچھے اپنی ساری مخدومیت چھوڑ گئے بڑے بڑے بالوں کے مشہور مخدوم فیشن کے علاوہ مخدوم سے ہر ملنے والا ایک نئے نظام حیات کا بھی گرویدہ ہوتا چلا گیا۔

وہ نظام حیات کہ دُنیا میں سارے انسان برابر برابر ہیں اور انسان کے سب سے بڑے دُشمن سرمایہ دارانہ نظام اور جاگیردارانہ نظام ہیں۔

ریاست کا ہر نوجوان مخدوم بنتا چلا جارہا تھا۔ حیدرآباد کے جیسے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔

— جاگیرداروں کا حیدرآباد۔

— جاگیردارانہ نظام سے کچلنے ہوئے اور بپھرے ہوے نوجوانوں کا حیدرآباد

۔ نظام سابع نواب میر عثمان علی خاں جاگیرداروں کے حیدرآباد کے تاجدار۔

۔ اور مخدوم محی الدین نوجوانوں کے حیدرآباد کے بے تاج بادشاہ۔

ریاست حیدرآباد بلکہ جنوبی ہندوستان کا شاید ہی کوئی نوجوان ایسا ہو جس پر مخدوم محی الدین کی پرچھائیں نہ پڑ چکی ہو اور جو مخدوم سے کسی نہ کسی طرح نہ متاثر ہوا ہو۔

جاگیردارانہ نظام بھلا مخدوم کو کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ حکومت کی دار وگیر سخت ہوئی تو مخدوم محی الدین انڈر گراؤنڈ ہو گئے لیکن اس وقت تک وہ خود ایک مکتب فکر School of Thought بن چکے تھے۔ ایک عقیدہ اور ایک نظریہ میں ڈھل چکے تھے اس لئے ان کا جسماً وجود ضروری بھی نہ تھا۔

وہ انڈر گراؤنڈ کیا ہو گئے گویا دکن کی سرزمین میں ترقی پسند تحریک جڑ پکڑ گئی، مخدوم اس وقت تک انڈر گراؤنڈ جڑ بنے رہے جب تک کہ اوپر زمین پر ترقی پسند تحریک ایک مضبوط، توانا پھل دار اور سایہ دار درخت نہیں بن گئی۔

مخدوم نے اپنی جوانی ترقی پسند تحریک کی جوانی پر سے نچھاور کردی۔ انہوں نے اپنی بیوی کا پیار اور اپنے بچوں کے سروں کا سایہ تک اس تحریک پر سے وار کر پھینک دیا۔

پھر جب وہ گھر لوٹے تو ان کی جوانی کی شام بہت گہری ہو چکی تھی لیکن

مخدوم کو کوئی دُکھ نہیں ہوا کیونکہ ان کے سامنے ایک نئی ترقی پسند نسل کی مَسیں بھیگ رہی تھیں۔

میں تو بلاشبہ یہی کہوں گا کہ ریاست حیدر آباد کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف سب سے پہلے جس جیالے نوجوان نے بغاوت کا علم بلند کیا وہ مردِ حُر مخدوم محی الدین ہی تھا۔ جو اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل اور پھر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ کارواں چلتا گیا۔ کارواں بڑھتا گیا۔ اور میر کارواں مخدوم محی الدین کی رہنمائی میں جنوبی ہندوستان کے نوجوانوں کی ایک ساری نسل چل پڑی۔

مجھے تو یوں بھی محسوس ہوتا ہے جیسے سلطان ٹیپو شہید کی روح کے آگے شرمسار خاک دکن نے اپنے ایک ناعاقبت اندیش بیٹے کے ایک گھناؤنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لئے دو سپوت پیدا کئے۔ ایک بہادر یار جنگ، دوسرا مخدوم محی الدین۔ اب مجھے یقین ہے کہ عرش بریں پر شیر دل ٹیپو نے پہلے بہادر یار جنگ کو اور اب مخدوم محی الدین کو بے اختیار اپنے سینے سے لگا لیا ہوگا۔ اور دلوں کی اس رگڑ نے دکن کے ماتھے سے غداری کا کلنک کا ٹیکہ بھی مٹا دیا ہوگا۔

میں آخری بار مخدوم صاحب سے اگست ۱۹۶۰ء میں حیدر آباد میں ملا تھا۔ اسی اگست کے مہینے میں جب وہ ہم سب سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ میں بارہ سال کی اذیت ناک جدائی کے بعد اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں سے ملتے حیدر آباد پہنچا، وہاں میرے بڑے بھائیوں میر عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر کے اخبار سیاست میں

عابد علی خاں کا ایک "رپٹائرنگ روم" تھا جو دراصل مخدوم صاحب کے بقول شاہد صدیقی مرحوم "ٹھیّہ" تھا۔ مخدوم صاحب اپنے کاموں سے فارغ ہوکر گھڑی دو گھڑی وہیں ٹھیکی لیتے۔ برس ہا برس بعد ان سے میری ملاقات وہیں ہوئیں۔ بڑی شفقت سے سینے سے بھینچ کر ملے۔ پھر انہیں وہ پُرانا زمانہ یاد آگیا جب وہ مجھ سے پان سگریٹ منگوایا کرتے تھے چنانچہ بڑی پیار بھری سرزنش کے انداز میں بولے :-

"تم پاکستان سے آئے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اب تم سے پان سگریٹ وغیرہ نہیں منگوایا کروں گا۔ اتنے برس بعد آئے ہو۔ وہ ہے میرے میلے کپڑے۔ اٹھاؤ انہیں اور دُھلا لاؤ کسی لانڈری سے۔"

میں ۱۷ دن حیدر آباد میں رہا۔ ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ وہ اپنے پُرانے دوستوں خاص طور پر حضرت فیض احمد فیض، حضرت جوش ملیح آبادی، سید سبط حسن مرزا ظفر الحسن، محی الدین غازی، احمد علی علوی، محمد عمر مہاجر اور نظر حیدر آبادی مرحوم کے بارے میں بار بار پوچھتے تھے پھر بھی ان کا جی نہ بھرتا تھا۔ سب سے زیادہ سید سبط حسن اور مرزا ظفر الحسن کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ میں تھوڑا بہت تو مرزا ظفر الحسن کے بارے میں بتا دیا کرتا تھا لیکن سبط صاحب کے بارے میں مشکل یہ تھی کہ میں سبط صاحب کا بھی اتنا ہی احترام کرتا ہوں جتنا کہ مخدوم صاحب کا کرتا تھا۔ ان میں اور مجھ میں بھی خوردی اور بزرگی کا وہی فاصلہ ہے جو مجھ میں اور مخدوم صاحب کے درمیان تھا۔ اس لئے میں کچھ زیادہ نہ بتا سکتا۔

تو وہ جیسے چڑ کر کہتے :-

"جب تم سبط کے بارے میں وہی ساری باتیں بتاتے ہو جو پاکستان سے آنے والا ہر شخص بتا دیتا ہے تو پھر تمہیں کیا تکلیف تھی جو تم پاکستان سے آئے ہو۔ ؟!

ان کی ان باتوں میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ پاکستان میں سب سے زیادہ سبط حسن اور مرزا ظفر الحسن سے پیار کرتے تھے۔

اس ملاقات کے کوئی چار سال بعد اچانک ۳ر جولائی ۱۹۶۴ء کو ان کا ایک خط ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا۔

جلیس، کتنے برسوں بعد تمھیں لکھ رہا ہوں، بہت بہت پیار، ایک چھوٹا سا کام ہے۔ تم ذاتی دلچسپی لے کر پورا کرو۔ میرے ایک بھتیجے ہیں، منان صاحب انہیں کسی بینک میں ملازمت دلانے کا سوال ہے اس وقت وہ کسی اور محکمے میں ہیں، انٹر کامرس پاس ہیں، دس سال کی سروس ہے گریجویشن کی کوشش کر رہے ہیں، شاید عمر کی پخ بھی ہو، تم ممتاز حسن صاحب جو نیشنل بینک کے منیجنگ ڈائرکٹر ہیں کہہ کر یہ کام کرادو، منان اور اس کی بیوی ثریا (میری بھتیجی) پر بڑا احسان ہوگا اور میں ممنون ہوں گا۔

تمہارا

مخدوم محی الدین

اس خط کے بعد نہ ان سے خط و کتابت ہوئی اور نہ ملاقات، البتہ ایک بار ان کے بارے میں یہ خبر آئی کہ وہ انڈرگراؤنڈ ہو گئے ہیں، اس خبر پر کیسے یقین آسکتا تھا۔ کیونکہ اب وہ آزاد ہندوستان کے ایک بہت بڑے راہ نما تھے۔ اور عوام کے اتنے محبوب لیڈر کہ حکومت ان پر ہاتھ ڈالے تو حکومت کے پاؤں اکھڑ جائیں۔

اُس وقت تو وہ خبر واقعی غلط نکلی۔ لیکن اب — اب یہ خبر بالکل سچّی ہے۔

مخدوم محی الدین اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انڈرگراؤنڈ ہو گئے ہیں۔

پیاری زمین کا وہ عاشق جانباز مخدوم، زمین کو چھوڑ کر آسمان کی طرف بھلا کیوں جاتا۔ ؟

اس نے تو آسمان کو کبھی چاہا ہی نہیں۔

جبھی تو زمین نے اسے اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا ہے۔

زمین اور اس کا محبوب مخدوم اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو چکے ہیں۔

اب فلک کج رفتار انہیں ایک دوسرے سے کبھی بھی جُدا نہیں کر سکتا۔

کبھی نہیں۔



تنویر نقویؒ

بالآخر تنویر نقوی بھی چلا گیا۔

کوئی سال بھر پہلے ہی تنویر نقوی نے دُنیا سے چلے جانے کے لئے "رختِ سفر" باندھ رکھا تھا۔

پچھلے سال لاہور میں اسی نومبر کے مہینے میں تنویر سے میری بڑی اچانک سرسری اور بڑی مختصر ملاقات ہوئی تھی اس کو دیکھ کر دل دھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔ تنویر نقوی عہدِ شباب میں بڑا گول مٹول پہلوان ہیکل اور خوبرو نوجوان تھا۔ سب تو اسے "شاہ جی" کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن میں اسے "پہلوان جی" کہا کرتا تھا۔

پہلے جب بھی میں صحت مند تنویر نقوی کو دیکھتا تھا۔ مجھے خوشی ہوتی تھی

لیکن اب جو تنویر پر نظر پڑی تو دل دھک ہو کر رہ گیا۔ کہاں وہ میرا پیارا پہلوان جی!
اور کہاں یہ زندگی کا بجھتا ہوا بھڑکتا چراغ۔!
میں نے اپنے جذبات پر قابو پا کر پوچھا۔
"پہلوان جی۔ کراچی چلو گے۔؟"
تنویر نقوی کو بھی جیسے اپنی اصلی منزل معلوم ہو گئی تھی۔ اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے انگشت شہادت آسمان کی طرف اُٹھا دیا۔ اور بڑے مایوس لہجے میں بولا۔
"اب تو صرف ایک ہی سفر باقی رہ گیا ہے"۔
میں نے رسمًا اسے اسی طرح ڈھارس دی جس طرح ایسے موقعوں پر لفظی ڈھارس دی جاتی ہے۔ اور پھر اس کے کہنے پر میں لکشمی چوک کے پرانے ہوٹل "کنگ سرکل" میں چلا گیا۔ کیونکہ تنویر نے کہا۔
آخری ایک ایک پیالی چائے ہو جائے۔
پھر اس کے بعد ملاقات ہو یا نہ ہو۔
اندر میرا عزیز دوست اور کہانی نویس ریاض ارشد اور میرا پیارا دوست فلم ایڈیٹر اصغر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چائے میں شریک ہو گئے۔ میں اس کی گرتی ہوئی صحت یا بڑھتی ہوئی موت کے بارے میں باتیں جتنی بھی ٹالتا رہا۔ تنویر پھر پھر کر اسی موضوع پر آتا رہا کہ ــــ ع اب تو جانا ہی عدم کو ہے مجھے

میں نے مذاق میں کہا۔

پہلوان جی۔ تم تو دُنیا کے سارے انسانوں کے مرنے یعنی روزِ قیامت تک زندہ رہو گے اور ایک نظم یا فلمی گیت روزِ حشر پر بھی لکھو گے۔

تنویر بڑی زور سے ہنسا۔

" ضرور لکھوں گا مگر وہیں آسمان پر بیٹھ کر لکھوں گا"

میں نے اس وقت تو اس کو خوش کرنے کے لئے اس کی درازئ عمر کی دعائیں مانگیں مگر اس وقت میرا دل بھی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ

" واقعی تنویر اب زیادہ دن اس دُنیا میں نہیں رہے گا۔ اس کا چل چلاؤ شروع ہو چکا ہے"

عجب اتفاق ہے۔

اسی سال پچھلے مہینے (اکتوبر) کے پہلے دن فلمی اور ادبی دُنیا کا ایک صاحب طرز ادیب اور ہدایت کار ریاض شاہد اس دُنیا سے چلا گیا اور اس کے ٹھیک ایک مہینے کے بعد نومبر کے پہلے دن فلمی اور ادبی دُنیا کا دوسرا صاحب طرز شاعر تنویر نقوی بھی یاروں اور پیاروں کے دلوں پر گہرے اَن مٹ داغ ہائے مفارقت لگا گیا۔

ریاض شاہد اور تنویر نقوی دونوں جیسے گزشتہ سال بھر سے دُنیا سے جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔

تنویر نقوی کی تیاری کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تنویر ریاض شاہد سے پہلے چلا جاتے گا۔ بہرحال جانا دونوں کا ٹھہر گیا تھا پہلے گئے یا دیر سے گئے اب دونوں اس وقت جنت ہی میں ہوں گے۔

میں نے تنویر نقوی کا نام اس وقت پہلی بار سُنا تھا جب میں علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ اس نے ایک بڑی باغیانہ نظم لکھی تھی۔

"دُنیا پاگل خانہ ہے"

یہ نظم بعد کو کسی فلم میں فلمائی بھی گئی تھی' ان دنوں فلمی دُنیا میں ایک "تُک بند" شاعر بالو ڈی این مدھوک کا بڑا شہرہ تھا۔ ڈی این مدھوک اوٹ پٹانگ فلمی گیت لکھتا تھا مثلاً

جب تم ہی چلے پردیس

لگا کر ٹھیس

او پتیم پیارا۔

تو صاحب ذوق اصلی شاعر جھلا اُٹھتے تھے کہ یہ کیا شاعری ہے ؟۔ اور یہ کیا زبان ہے کہ

"تم چلے ...... او پریتم پیارا۔"

آرزو لکھنوی کے بعد فلمی دُنیا جیسے کسی اچھے شاعر کے لئے ترس رہی تھی اور پھر اچانک ہم نے سُنا کہ تنویر نقوی فلمی دُنیا سے وابستہ ہو گیا ہے۔

تنویر نے فلمی دنیا میں داخل ہوتے ہی فلمی شاعری میں زبان اور اسلوب کے چار چاند لگا دیئے۔

ان دنوں ملکہ ترنم نور جہاں کی بڑی بہن عیدن بیگم تنویر نقوی کی رفیقۂ حیات تھیں، تنویر نقوی کے گیت اور ملکہ ترنم نور جہاں کی سحر آگیں آواز۔ بمبئی کی فلمی دنیا میں دھوم مچ گئی۔ انہی دنوں میں بھی اپنے عزیز دوستوں حمید اختر (حال اسسٹنٹ ایڈیٹر امروز لاہور) اور مشہور شاعر ساحر لدھیانوی کے بلاوے پر بمبئی پہنچ گیا۔ اس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین شباب پر تھی، کیونکہ تقریباً سارے ہی ترقی پسند مصنف یعنی کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ، سبھی جوان تھے۔ تنویر نقوی بھی انہی میں سے ایک تھے۔

بمبئی میں تنویر سے صرف ایک بار سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ گلشن محل ماہم میں رہتا تھا۔ وہاں عوامی اداکار علاؤالدین، انقلابی شاعر عارف جلالی، کریکٹر ایکٹر سکندر، اور فلمساز و ہدایت کار حبیب سرحدی وغیرہ بھی رہتے تھے اس زمانے میں تنویر کا یہ گیت سارے ہندوستان میں گونج رہا تھا۔

ع "یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے"

جب ہمارا تعارف ہوا تو ہم دونوں ایک دوسرے سے بڑی گرم جوشی سے بغلگیر ہو گئے۔ کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے نام سے غائبانہ طور پر اچھی طرح

واقف تھے۔

بمبئی میں ہماری ملاقات پھر اس لئے بھی نہ ہوسکی کہ اس کے بعد ہندوستان تقسیم ہوگیا، اور میں بھی پاکستان چلا آیا۔

پاکستان میں تنویر سے بے شمار ملاقاتیں رہیں

ان کے ایک دوست (بلکہ دوست کا لفظ کچھ ہلکا ہے، موزوں لفظ "عاشق" ہوسکتا ہے) ان کے ایک عاشق بلکہ تنویر نقوی کے مجنوں سندھ کے ایک تاریخی گاؤں ماتلی کے رئیس کریم بخش بلوچ ہیں۔

رئیس کریم بخش بلوچ سچ مچ تنویر نقوی کے "مجنوں عاشق" ہیں، انہیں تنویر کا سارا کلام ازبر ہے، اکثر ایسا ہوا کہ تنویر اپنی کوئی نظم، اپنا کوئی گیت اور اپنی کوئی غزل بھول گیا تو رئیس کریم بخش بلوچ نے فوراً وہ نظم، گیت یا غزل لفظ بہ لفظ سُنا دی۔

تنویر موجود ہو یا نہ ہو رئیس کریم بخش بلوچ ترنگ میں آنے کے بعد صرف تنویر ہی کا کلام لہک لہک کر گاتے تھے۔

ادھر تنویر کو بھی رئیس کریم بخش بلوچ اور ان کے شہر ماتلی سے ایسا عشق تھا کہ انہوں نے ماتلی کو یوں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

حسین ماتلی تجھ پہ لاکھوں سلام

تنویر اور رئیس کریم بخش بلوچ نے مل کر ایک فلم کا بھی آغاز کیا تھا۔ "بھلیلی" لیکن تنویر کی بیماری کا آغاز ہوا اور وہ فلم ادھوری رہ گئی۔ بھلیلی اس ندی کا نام

ہے جو تنویر کے خوابوں کے گاؤں "مائلی" کو چومتی ہوئی بہتی ہے، تنویر نے اسی ندی کے نام پر رئیس کریم بخش بلوچ کے تعاون سے فلم کا آغاز کیا تھا۔

"آج صبح گیارہ بجے اور ایک بجے جب میں نے ریڈیو خبروں میں آخری خبر یہ سنی"

"آج صبح اردو کے معروف شاعر تنویر نقوی کا لاہور میں انتقال
ہوگیا۔ ان کی عمر ۵۳ سال تھی۔"

تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے کلیجے میں برچھی ماری ہے، دل اب تک لہولہان ہے، جانے میرے پیارے دوست رئیس کریم بخش بلوچ کا اس خبر کے بعد کیا حال ہوگا۔!

۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران تنویر کا یہ گیت
رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو
یہ شفق رنگ لہو۔

اتنا مقبول ہوا کہ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ اُدھر شمال میں مشہور عالم "دیوار چین" سے بھی ٹکرانے لگا۔ چنانچہ ۶۵ء کی جنگ کے بعد چین کا ایک ثقافتی طائفہ پاکستان کے دورے پر آیا اور چینی قونصل خانے کی ایک تقریب میں اس ثقافتی طائفے کی دو خوش گلو چینی لڑکیوں نے جیسے ہی یہ گیت شروع کیا۔

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو

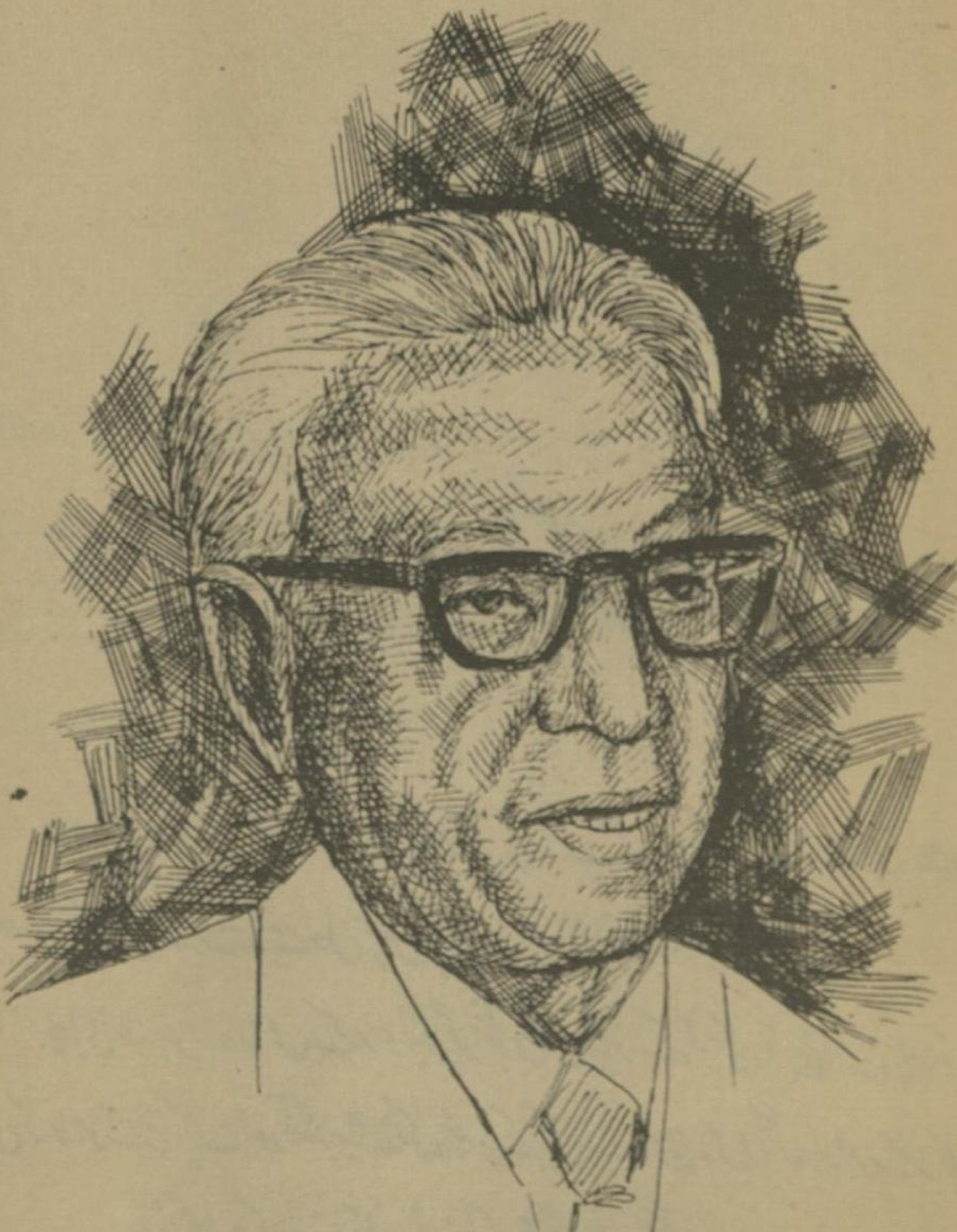
تو پاکستانی حاضرین حیرت اور خوشی سے دیوانہ وار تالیاں بجانے لگے۔

ان دنوں تنویر نقوی اپنے کسی کام سے کراچی میں تھے۔ چینی قونصل خانے کے افسروں کو اس کا علم نہ تھا۔ میں نے چینی قونصل جنرل سے ذکر کیا تو وہ بھی تنویر نقوی سے ملنے کے لئے بے تاب ہو گئے۔

دوسرے دن سہ پہر میں تنویر کو ساتھ لے کر چینی قونصل خانے گیا، قونصل جنرل اور دوسرے سارے چینی افسر تنویر سے مل کر بہت خوش ہوئے" اور انہوں نے ہمیں نفیس ترین چینی چائے کے تحفے بھی دیئے۔ توقع تھی کہ تنویر اس چین کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ جس کی تعریف میں اس نے تین نظمیں لکھی تھیں، مگر اس کی صحت نے اجازت نہ دی اور وہ چین سے دور اتنی دور چلا گیا۔ کہ اب اس سے ملنے والوں کو اسی کے پاس جانا ہوگا۔ وہ اب زمین پر کسی سے بھی ملنے نہیں آئے گا۔

" اچھا تنویر۔ جاؤ۔ خدا کے حوالے!

رب راکھا۔



شوکت تھانوی

ادھر کچھ دنوں سے۔ دل۔ جیسے غم کی آگ کے چولھے پر چڑھا ہوا ہے اور اس غم کی آگ کی حدت سے دل پگھل پگھل کر آنسو آنسو ہوا جا رہا ہے۔

بھابی طاہرہ اور اس کے دو جگر گوشوں کی یاد کے غم کی آنچ آج کچھ ذرا ہلکی ہوئی تھی کہ لاہور سے ایک اور تشویشناک خبر کے تیل نے آج اس آگ کو اور بھڑکا دیا ہے،

پھر ایک نیا آنسو اُمنڈ کر آنکھ میں آگیا ہے

بظاہر تو یہ میری آنکھ ہے اور یہ میرا آنسو

لیکن محسوس ایسا کرتا ہوں جیسے یہ میری آنکھ نہیں۔ میو ہسپتال ہے اور یہ آنسو نہیں۔ بلکہ شوکت تھانوی ہے۔

اور اب میں پریشان ہو کر گڑگڑا کر خداوند تعالےٰ سے دُعائیں مانگ رہا ہوں کہ بجھتے چراغوں کو بھی پھر سے روشن کر دینے والے روشنیوں کے خالق -!

یہ آنسو آنکھ سے لوٹ کر واپس پھر دل میں جا گرے -

دل جو زندگی کا سرچشمہ ہے -

اے مسیحاؤں کے مسیحا -!

یہ آنسو آنکھ سے ٹپکنے نہ پاتے -!

بڑی سی بڑی زندگی سے بھی ہمیشہ کھڑے ہو کر سینہ سپر ہو کر لڑنے والا شوکت تھانوی آج میو ہسپتال کے ایک بستر پر گرا ہوا زندگی سے دست و گریباں ہے -

اس کے اردگرد بڑے بڑے ماہر مسیحا ڈاکٹر کھڑے ہیں۔ قیمتی سے قیمتی زندگی بخش دواؤں کی شیشیاں رکھی ہوئی ہیں لیکن ڈاکٹروں کی پر اسرار سرگوشیوں سے کانوں میں یہ بھنک پڑ رہی ہے -

" دوا نہیں — دُعا "

ڈاکٹروں کے چہرے جُھکے ہوئے ہیں۔ دواؤں کی شیشیاں خالی ہو گئی ہیں -

لیکن اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ میرا بزرگ، میرا ساتھی، میرا جلیس - شوکت تھانوی ایک بار پھر زندگی کو پچھاڑ کر بستر سے اُٹھ کھڑا ہو گا -

کیونکہ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ

" دوا نہیں — دُعا "

اور شوکت تھانوی کے لئے "دعاؤں" کی کوئی کمی نہیں ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کے پاس شوکت تھانوی کی زندگی کے لئے دعاؤں کے بے شمار ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں۔

اور خداوند کریم یقیناً اپنے ان بے شمار بندوں کی دعاؤں کو ضرور شرف قبولیت عطا فرمائے گا۔

" خلق اللہ کی خدمت اللہ کی سب سے بڑی عبادت ہے ۔"

اس غم خانۂ حیات میں خدا کے بندوں کو خوشیاں مسکراہٹیں اور قہقہے عطا کرنا اللہ کے بندوں کی سب سے بڑی خدمت اور اللہ کی سب سے بڑی عبادت ہے۔

شوکت تھانوی نے بھی اپنی ساری زندگی خلق اللہ میں خوشیاں مسکراہٹیں اور قہقہے بانٹنے میں صرف کر دی ہے۔

وہ انسانوں کا سچا خادم ہی نہیں بلکہ اللہ کا ایک سچا عابد بھی ہے۔

اور خداوند لایزال یقیناً اس خدمت اور اس عبادت کے عوض شوکت تھانوی کو انعام سے ضرور سرفراز فرمائے گا۔

اور وہ انعام شوکت تھانوی کی "ازسرِ نو زندگی" ہی ہو گا۔

انسانوں میں خوشیاں اور مسکراہٹیں بانٹنے والا شوکت تھانوی آج خود خوشی اور ہنسی سے محروم میو اسپتال کے ایک بستر پر پڑا ہوا ہے اور اتنا بے نیاز ہے کہ وہ ہم سے اور آپ سے اپنا "قرض" بھی واپس مانگنے نہیں آتا۔

•

لیکن کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم خود اس کا قرض لوٹانے جائیں۔ ؟

اس لئے آیئے۔ دعاؤں کے ہاتھوں کے کشکول پھیلا کر خداوند رحیم و کریم کی بارگاہ میں چلیں اور اس سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔

اے مسیحاؤں کے مسیحا۔ !

تیرہ بندہ شوکت تھانوی تیرے ہی بندوں کی زندگیوں کو مسرت کے چراغوں سے روشن کرتا رہا۔ مسکراہٹوں کی کلیوں اور قہقہوں کے پھولوں سے مہکارتا رہا۔ وہ ساری زندگی تیرے بندوں کی خدمت کرتا رہا۔ وہ ساری زندگی تیری عبادت کرتا رہا۔

خداوند عظیم و برتر۔ !

ابھی زندگی میں بہت غم ہیں۔ تیرے بندوں کو شوکت تھانوی کی مسکراہٹوں اور قہقہوں کی اب اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔

مسیحاؤں کے مسیحا۔ !

زمین کے مسیحاؤں نے مایوسی کے بوجھ سے اپنے چہرے جھکا لئے ہیں۔ دواؤں کی ساری شیشیاں خالی ہوگئیں ہیں۔

مگر پروردگار۔ دُنیا کی ساری دوائیں ایک طرف اور تیری بارگاہ میں قبول ہونے والی دعا ایک طرف۔ !

خالق ازل۔ !

دواؤں کی ساری شیشیاں خالی ہوگئی ہیں اس لئے اب ہمارے آنسوؤں

ہی کو شوکت تھانوی کے لئے "آبِ حیات" بنا دے۔

دعاؤں کے لئے اُٹھنے والے ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔ اسی لئے میں اپنا قلم رکھ دیتا ہوں اور خالی ہاتھوں کا کشکول پھیلا کر تیری بارگاہ میں گڑگڑاتا ہوں مالک کہ

شوکت تھانوی کی زندگی کو ہمارے آنسوؤں کا "آبِ حیات" پلا دے۔

آمین۔ ثمہ آمین۔

دُعا کے لئے اُٹھنے والے ہاتھ آنکھوں سے قریب ہوتے ہیں۔ تاکہ دُعا قبول نہ ہو تو آدمی آنسو پونچھ لے۔

لیکن نہ تو دُعا قبول ہوتی ہے اور نہ آنکھوں میں آنسو ہیں۔!

آگ بہت تیز ہو تو پانی بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے اور برتن خالی ہو جاتا ہے۔ کہ ہاتھ اسے چھو نہیں سکتے۔

آج آنکھیں بھی اسی طرح خالی ہیں اور اسی طرح تپ رہی ہیں۔

آنکھیں بغیر آنسوؤں کے بھی تو روتی ہیں۔!

ازل سے تو یہی عمل چلا آ رہا ہے کہ جب کوئی انسان زمین میں دفن ہو جاتا ہے تو اس کے اِردگرد لوگوں کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آتے ہیں۔

لیکن شوکت تھانوی زمین میں دفن ہو گیا ہے اور اس کے اردگرد لوگوں کی آنکھیں خالی ہیں۔!

شوکت تھانوی کے پاس اس کی ساری زندگی میں انسانوں کے لئے ایک

آنسو بھی نہیں تھا تو پھر دُنیا سے جاتے ہوئے وہ آنسو کہاں سے دے جاتا۔!

اس کے پاس تو انسانوں کے لئے صرف مسکراہٹیں تھیں، صرف قہقہے تھے۔

اس کی دوکان میں آنسو نام کی کوئی جنس تھی ہی نہیں۔

اور اگر اس کے پاس آنسو تھے بھی۔ تو وہ آنسو اس کے اپنے استعمال کے لئے تھے۔ اسی طرح شوکت تھانوی نے بھی آنسو اپنے لئے چھپا رکھے تھے اور مسکراہٹیں دوسروں کے لئے بکھیر دی تھیں۔

وہ چھُپ کر روتا تھا اور کھُل کر ہنستا تھا۔

مُسکراہٹ اور قہقہے ختم ہو جائیں تو لوگ آنسو بیچنے لگتے ہیں، لیکن شوکت تھانوی کے پاس مسکراہٹیں اور قہقہے ابھی ختم بھی نہ ہوتے تھے کہ زندگی کی شام ہو گئی۔ رات پڑ گئی اور اندھیرے میں موت کے قزاق نے شوکت تھانوی کو سربازار لوٹ لیا۔ اغوا کر لیا اور ہمیشہ کے لئے غائب کر دیا۔

شوکت تھانوی کی مسکراہٹوں اور قہقہوں کی دوکان تو اب بھی کھُلی ہوئی ہے۔ اور ہمیشہ کھُلی رہے گی لیکن اب شوکت تھانوی اس دوکان پر کبھی واپس نہیں آئے گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر خوشیاں مُسکراہٹیں اور قہقہے بھی زمین ہی سے جاتے ہیں اور جب کبھی آسمان پر خوشیوں مسکراہٹوں اور قہقہوں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے یا پُرانا ہو جاتا ہے تو نئی مسکراہٹیں اور تازہ قہقہے زمین ہی سے منگوائے جاتے ہیں۔

اور اب واقعی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے منشی سجاد حسین، رتن ناتھ سرشار،

اکبر الہ آبادی، مرزا فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی۔ چراغ حسن حسرت، مجید لاہوری۔ پطرس، عبدالمجید سالک اور حاجی لق لق جو مسکراہٹیں اور قہقہے جنّت کے باشندوں کے لئے گئے تھے وہ ختم ہو گئے تھے اور جنّت کے باشندے نئی مسکراہٹوں اور تازہ قہقہوں کے لئے بے چین ہو گئے تھے۔

جبھی تو شوکت تھانوی کو بھی آسمان پر طلب کر لیا گیا۔

جب کوئی پیارا یا کوئی مہمان اچانک بغیر اطلاع کے جدا ہو کر چلا جاتا ہے تو بہت پریشانی ہوتی ہے۔ بہت غم ہوتا ہے لیکن جب کوئی پیارا یا کوئی مہمان یہ اطلاع دیتا ہے کہ

میں عنقریب چلا جاؤں گا۔

تو میزبان اس سے جدا ہونے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جاتے ہیں اور جب وہ جدا ہو جاتا ہے تو وداع کرنے والے کا سر غم کے بوجھ سے نہیں جھکتا بلکہ صرف مشیت ایزدی کے آگے جھک جاتا ہے۔

شوکت تھانوی نے بھی اپنے وداع ہونے کی اطلاع مہینہ بھر پہلے ہی دیدی تھی۔ چنانچہ مہینے بھر پہلے میں نے شوکت تھانوی کو ایک خط لکھا تھا کہ :-

"آپ" کچھ یادوں اور کچھ باتوں" کے ذریعے اپنی پچھلی ساری زندگی کو جس سلیقے سے سمیٹ رہے ہیں وہ مجھے بہت پسند آیا۔ آپ کی یہ تصنیف اُردو ادب کی ایک دلچسپ اور مستند تاریخ بن

جائے گی۔ بہتر ہے کہ آپ "پہاڑ تلے" کے کالم کی بجائے روزانہ یہی یادیں اور یہی باتیں لکھا کریں کیونکہ مجھ سے ہفتے بھر کا انتظار نہیں ہوتا۔

اس کے جواب میں شوکت تھانوی نے لکھا۔

جلیس پیارے۔ معانقہ اور بوسے۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میری یادوں اور باتوں کو بہت پسند کیا لیکن اب ایسا محسوس کرتا ہوں کہ جیسے وقت بہت کم ہے اور پچھلی ساری زندگی بہت بڑی۔ اور اتنی بڑی زندگی کو شاید پوری طرح نہ سمیٹ سکوں۔

میرے لئے دُعا کرو —— اگر دُعا کے قائل ہو تو —— ورنہ وہ بھی میں ہی کرلوں گا۔

تمہارا بھائی

شوکت

نہ میری دُعا قبول ہوئی اور نہ خود شوکت تھانوی کی وقت کی پابندی کوئی موت سے سیکھے۔!

مگر ساتھ ہی ساتھ اگر میں یہ بھی کہہ دوں کہ شوکت کے لئے موت نے غالباً پہلی بار "پابندیٔ وقت" کی رُوایت اور اصول کو توڑ ڈالا۔ تو یقیناً میں غلط نہیں کہہ رہا۔

کیونکہ موت تو مہینہ بھر پہلے ہی شوکت کے پاس پہنچ چکی تھی اور جسے دیکھ کر

ایشیا کے سب سے بڑے اسپتال میو اسپتال کے بڑے بڑے ڈاکٹر شوکت کے بستر کے پاس سے چپ چاپ ہٹ گئے تھے۔

آغازِ اپریل ہی سے ہر روز ڈاکٹر دبی دبی آواز میں سرگوشی میں کہا کرتے تھے۔

"شاید آج — شاید کل — !"

لیکن شوکت ایسا رونق محفل، ایسا انسان، ایسا فقرہ باز، ایسا حاضر جواب، ایسا ہنسوڑ، ایسا لطیفہ، ایسا باغ و بہار اور ایسا مجلسی آدمی کہ اس کا بڑے سے بڑا دشمن بھی ایک بار اس کے پاس بیٹھ جائے تو پھر اُٹھنا بھول جائے۔

چنانچہ موت بھی اسے ۲۳ مارچ ہی کو لے جانے آئی تھی لیکن وہ شوکت کی مقناطیسی شخصیت اس کی باتوں، اس کی مسکراہٹوں اور اس کے قہقہوں میں کچھ ایسی کھو گئی کہ ۹ مئی تک اسے یاد ہی نہ آیا کہ وہ شوکت کو لے جانے کے لئے آئی ہے۔

جبھی تو جب شوکت خود تھک کر سو گیا۔ تب اچانک موت کو اپنا فرض یاد آیا۔ اور وہ اسے سوتے سوتے ہی چپکے سے اُٹھا لے گئی۔ تاکہ کہیں شوکت پھر جاگ پڑے تو اس کی دلچسپ باتوں میں موت اپنا فرض پھر سے نہ بھول جائے۔

اگر شوکت خود اپنی آنکھیں آپ نہ بند کر لیتا تو موت بھی اتنی بداخلاق اور بے مروت نہ تھی کہ وہ خود ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھوں پر پلکیں ڈھانپ دیتی!

اس دُنیا میں کسی کو بھی نہیں رہنا ہے۔ جانا سب کو ہے، تو جانے والوں کیلئے رونا کیسا — ؟

کتنے پیارے پیارے لوگ چلے گئے اور ہم کتنی کتنی بار روئے۔
رونے سے تو کوئی پلٹ کر نہیں آتا۔
تو پھر ہم شوکت کے لیئے کیوں روئیں۔؟
جب شوکت کی زندگی نے ہمیں کبھی نہیں رُلایا۔
تو اس کی موت ہمیں کیوں رُلائے۔؟
اسی لئے میں شوکت کی موت پر نہیں روؤں گا۔
اگر میری آنکھوں میں آنسو بھی آجائیں تب بھی نہیں روؤں گا۔
اس دُنیا میں ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ
"آنکھوں میں آنسو ہوں تب بھی تو انسان نہیں روتا۔"
آنسو نہ ہو تب بھی روتا ہے
آنسو ہوں تب بھی نہیں روتا



شاہد احمد دہلوی

پاکستانی اہلِ قلم کا یہ پہلا اجتماع ہے کہ اس میں شاہد احمد دہلوی موجود نہیں ہیں۔

اس سے پہلے جب کبھی بھی پاکستان کے ادیب شاعر اور دانشور کہیں اکھٹے ہوتے اور شاہد صاحب کو کہیں دیر ہو جاتی تو ان کا انتظار کیا جاتا تھا۔ شہ نشیں پر سب سے زیادہ نمایاں جگہ ان کے لئے ایک کرسی خالی رکھی جاتی تھی اور جیسے ہی شاہد صاحب تشریف لے آتے تو سارے بڑے چھوٹے ادیب اور شاعر "شاہد بھائی" کہتے ہوئے ان کی طرف بڑھتے اور شاہد بھائی اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں ہر اک سے مصافحہ کرتے اور ہر ایک سے پوچھتے۔

"کہئے حضرت۔ کیسے مزاج ہیں ؟"

لیکن آج پاکستانی اہل قلم کا یہ پہلا اجتماع ہے کہ اس میں شاہد بھائی کیلئے کوئی کرسی خالی نہیں ہے۔ وہ آج نہیں آئیں گے۔ وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔

اب ان کا انتظار نہ کرو یارو۔

اب انہیں زندگی بھر صرف یاد ہی کرتے رہو یارو۔

اب شاہد بھائی کی زندگی کا تابناک سورج غروب ہو چکا ہے ان کے پیچھے غم کا بڑا گہرا اندھیرا پھیل گیا ہے۔ آنسوؤں کے ستاروں سے بھی یہ اندھیرا کم نہیں ہوتا۔ جب ہی تو آج ہم سب ان کی یادوں کے چراغ جلانے کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں،

لیکن میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگ یاد کا چراغ کیوں جلاتے ہیں۔ ؟

یاد کے چراغ اور قبر کے چراغ میں فرق ہی کیا ہے ! یاد کا چراغ ہو یا قبر کا چراغ۔ یہ کہاں راہنما ہوتے ہیں۔؟ ان چراغوں کی روشنی میں میں کون کب پلٹ کر آیا ہے کہ شاہد بھائی بھی لوٹ آئیں گے۔!

لیکن قبر پر چراغ جلانا ایک پرانی رسم جو ٹھہری یہ جانتے ہوئے بھی کہ جانے والا لوٹ آنا تو کجا پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اسے آواز دینا انسانوں کی ازلی عادت جو ٹھہری۔!

یہ عادت ہے یا مجبور انسان کا محض اتمام حجت۔ میں نہیں جانتا لیکن کبھی نہ لوٹ کر آنے والوں کو سب ہی اسی طرح اس وقت تک پکارتے رہتے ہیں جب

تک کران کی آوازیں رُندھے ہوتے اور بھراتے ہوتے گلوں میں ڈوب نہیں جاتیں،
چنانچہ ہم بھی اب قیامت تک آوازیں دیتے رہیں۔

"شاہد بھائی۔ شاہد بھائی۔ شاہد بھائی !!"

قبر پر چراغ جلانا بھی ازل کی رسم ہے۔ میں بھی اب اپنی یاد کا ایک چراغ جلاتا ہوں۔ اس یاد کے چراغ کی روشنی پیچھے ماضی میں اس صدی کے چالیسویں سنگ میل تک پھیلی ہوتی ہے۔ اور اس روشنی میں، میں دیکھ رہا ہوں کہ اُردو ادب کی شاہراہ پر بڑی تام جھام کے قافلے گزر رہے ہیں، ان قافلوں میں سب سے پیچھے جو قافلہ ہے اس کے میر کارواں شاہد احمد دہلوی ہیں اور اہل کارواں میں عظیم بیگ چغتائی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، محمد حسن عسکری، غلام عباس، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، حجاب امتیاز علی وغیرہ وغیرہ نمایاں ہیں۔

آگے آگے خوبرو دلاویز "ساقی" ہے اور اس کے میخوار نغمہ خواں رواں دواں ہیں کہ

؎ اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

میں چوروں کی طرح دبے دبے پاؤں اس قافلے کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میری بچپن کی تمنّا مجھے بے چین کئے دے رہی تھی کہ میں بھی اس قافلے میں شرکت کی سعادت حاصل کرلوں۔

اُن دنوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانا ایسا ہو گا جس میں حضرت علامہ نیاز فتح پوری کا "نگار" حضرت علامہ رازق الخیری کا "عصمت" اور مسٹر شاہد احمد دہلوی بی اے آنرز کا "ساقی" باپ، ماں، بہن بھائی اور اولاد جیسا قریبی عزیز نہ ہو۔ میں اُن دنوں نویں جماعت کا طالب علم تھا اور اپنے بارے میں یہ ڈینگ ہانکا کرتا تھا کہ

"ایک دن آئے گا۔ جب میرا نام نگار اور ساقی میں چھپے گا۔"

اُس زمانے میں "نگار" "ساقی" اور "عصمت" میں کسی نئے قلمکار کا ایک بار بھی چھپ جانا اسے آناً فاناً ملک گیر شہرت کا خزانہ عطا کر دیتا تھا۔ اسی لئے اسی زمانے میں بڑے بڑے قلمکار تک بڑی ہمت باندھنے کے بعد ان دروازوں پر دستک دینے کی جرأت کرتے تھے چہ جائیکہ میں اسکول کا ایک ادنیٰ طالب علم۔!

لیکن میں نے اس قافلے کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس کے پیچھے دبے دبے پاؤں چلتا ہی رہا۔ اور جب ۱۹۴۱ء کے سنگ میل پر اس قافلے نے ستانے کے لئے پڑاؤ ڈالا تو میں قریب ہی گمنامی کی منڈیر پر چڑھ کر اور چھپ کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے عجب منظر تھا "ساقی" خم کے خم بانٹ رہا تھا۔ میرا بھی جی مچل رہا تھا کہ ساقی۔ ایک جام ادھر بھی۔"

اس وقت پتہ نہیں کس نے کرشن چندر نے یا قاسمی نے، منٹو نے یا بیدی نے باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ

"شاہد بھائی - یہ کیا بات ہے - یا تو ہم سب بہت تیز رفتار ہیں یا پھر ہمارے پیچھے کوئی نہیں آرہا ہے۔ پیچھے کسی نئے لکھنے والے کی چاپ تک نہیں سنائی دیتی۔

یہ سُن کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں اچانک دھم سے ان کے بیچوں بیچ کود پڑا۔ وہ سب چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے خود ہی اپنا دستِ تعارف بڑھا دیا کہ

"میں اس قافلے سے اپنا رشتہ استوار کرنے آیا ہوں۔"

"رشتہ" میرے افسانے کا نام بھی تھا اور میں نے شاہد بھائی کی اجازت سے وہ افسانہ اہلِ کاروں کو سُنایا۔ شاہد بھائی نے مجھے اُٹھ کر گلے سے لگالیا اور اعلان کیا کہ

یہ لڑکا آج سے قافلے میں شامل ہے۔

دیارِ اُردو ادب کے باشندوں سے میرا سب سے پہلا تعارف شاہد بھائی نے کرایا اور علامہ نیاز فتح پوری مرحوم نے اس دیارِ ادب میں رہنے کے لئے مجھے بے اندازہ شہرت کا ایک جگمگاتا مکان عطا کیا۔

میرے یہ دونوں محسن یکے بعد دیگرے اپنا سایۂ عاطفت میرے سر سے اُٹھا لے گئے اور شاہد بھائی کا سایۂ عاطفت کیا ہٹا کہ بڑی تیز اور ناقابلِ برداشت دھوپ میں برہنہ سر ہو گیا ہوں۔

ہر اہلِ دل کی طرح بیماریِ دل ہی نے شاہد بھائی کا بھی کام تمام کیا۔

دلّی شاہد بھائی کا دل تھی، دلّی شاہد بھائی سے کیا بچھڑی کہ دلّی ان کے لئے بیماریِ دل بن گئی۔ اگر وہ ساری زندگی بڑے پیار سے دہلی کی وزنی یاد کو اپنے نام کی پشت پر ڈھوتے ڈھوتے پھرتے رہے لیکن شاہد بھائی خود بھی تو بڑے تنک مزاج محبوب تھے، دلّی نے ان کے ساری عمر کے عشق کی پرواہ نہ کی تو وہ کیا پرواہ کرتے۔!

چنانچہ ان کی خودداری نے پاک سرزمین کی دو گز زمین تو قبول کر لی لیکن اس بیوفا دلّی کی بڑی بڑی ذاتی حویلیوں کا بھی پھر کبھی رُخ نہ کیا۔

عجیب بات یہ ہے۔ سب انسان تو ایک بار مرتے ہیں لیکن شاہد بھائی دو بار مرے۔

۱۹۴۷ء میں پہلی بار انتقال کیا۔

۱۹۶۷ء میں آخری بار انتقال کر گئے۔

انسان کی زندگی کے سارے برس جب ختم ہو جاتے ہیں، تو پھر اس دُنیا میں صرف اس کی برسی باقی رہ جاتی ہے۔

برسی یعنی کسی انسان کی موت کا دن۔

گویا انسان کی زندگی کے ہزاروں دن لوحِ دُنیا سے آناً فاناً میں مٹ جاتے ہیں صرف موت ہی کا دن باقی رہ جاتا ہے۔

اور اُس دن مرحوم کے یار اور رشتہ دار قلب و نظر سے اُوجھل مرحوم کی یاد کو

اس کی قبر کے لئے چراغوں سے منور اور خوشگفتہ پھولوں سے معطر کر دیتے ہیں۔

آج شاہد احمد دہلوی کی قبر پر بھی ننھے چراغ جل رہے ہیں اور ان کی قبر تازہ پھولوں سے مہک رہی ہے۔

شاہد احمد دہلوی ۶۱ برس کی زندگی لے کر ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کے دن اس دنیا میں آئے تھے۔ ۶۱ برس تک انہوں نے اپنی زندگی بڑے ٹھاٹھ سے خرچ کی۔ چنانچہ دنیا سے جاتے جاتے انہوں نے بڑے فخر سے اعلان کیا تھا۔

"بہت گئی۔ تھوڑی رہی۔ اللہ توفیق دے کہ بقیہ عمر بھی اسی
طرح بسر ہو جائے۔"

؎ شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

اللہ نے واقعی توفیق دی۔ بقیہ عمر بھی اسی طرح بسر ہو گئی اور شاد کام و بامراد وہ، ۲۷ مئی ۱۹۶۷ء کی رات زندگی سے دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔

شاہد بھائی کے اکسٹھ برس اب اس دنیا میں نہیں ہیں صرف ان کی برسی کا دن باقی رہ گیا ہے۔ اور یہ دنیا کی عجب ریت اور عجب رسم ہے کہ دن تو موت کا ہے لیکن موت لوحِ ذہن سے دور ہو جاتی ہے اور صرف زندگی ہی زندگی یاد آتی ہے۔

آج کا دن بھی شاہد احمد دہلوی کی موت کا دن ہے لیکن ان کی موت کہیں نظر نہیں آتی ان کی موت بالکل ہی نظروں سے اوجھل ہے۔ صرف ان کی زندگی ہی زندگی سامنے ہے

اکسٹھ برس دُور ماضی کے دُھندلکے میں دہلی کے محلّے کٹڑہ بڑیاں میں ڈپٹی نذیر احمد کی ڈیوڑھی میں ایک نوزائیدہ بچّے کے رونے کی آواز گونجتی ہے۔

دُنیا میں نووارد کا نام شاہد احمد رکھا گیا۔اب شاہد احمد کی زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔دہلی سے حیدر آباد، حیدر آباد سے پھر دہلی، دہلی سے علی گڑھ، علی گڑھ سے لاہور، لاہور سے پھر دہلی — دہلی آٹھویں بار اُجڑی، شاہد احمد دہلی کو چھوڑ کر کراچی پہنچے۔انہوں نے دہلی کو تو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔لیکن دہلی کا عشق ان کے دل سے نہ گیا۔اور ساری زندگی دہلی کے عشق کو وہ اپنے نام کی پیٹھ پر لادے لادے پھرتے رہے۔

ایک بار ۱۹۶۲ء میں دہلی میں ایک ثقافتی کانفرنس منعقد ہوئی۔پاکستان سے ادیبوں اور شاعروں کا ایک وفد اس کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا تھا۔اس وفد میں شاہد بھائی تھے اور میں بھی تھا۔میں، ابن انشاؔ اور دوسرے ساتھی تو نئی دہلی کی جگمگ سڑکوں پر گھوما پھرا کرتے تھے لیکن شاہد بھائی پُرانی دلّی کی یادوں کے کھنڈر میں جانے کیا کیا ڈھونڈتے رہے۔کٹڑہ بڑیاں، تباشوں والی گلی، گلی قاسم جان، احاطہ کالے صاحب، بازار بلی ماراں، پھاٹک حبش خاں، چاندنی چوک ......

لیکن شاہد بھائی عقیدے کو عشق پر ترجیح دیتے تھے۔اسی لئے جب ان کے سامنے انتخاب کا مرحلہ آیا یعنی انھیں دو شہروں میں سے ایک کو منتخب کرنا تھا۔تب بھی انہوں نے عقیدے کو عشق پر ترجیح دی۔

ایک طرف ان کا پیار — دہلی تھا۔

دوسری طرف ان کا عقیدہ۔ پاکستان تھا۔

لیکن انہوں نے ۸۱ برس پرانے پیار دہلی سے اپنا دامن چھڑا لیا اور اپنے عقیدے پاکستان کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی کے ہو رہے اور اب اسی کی آغوش میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

ایک صاحب شکوہ کر رہے تھے کہ

"لو صاحب ۔ ہم اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کو سال میں
صرف ایک دن یاد کرتے ہیں اور تین سو چونسٹھ دن انہیں بھلائے
رکھتے ہیں"

میں اس شکوے سے متفق نہیں ہوں ہم اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کو سال میں صرف ایک ہی دن یاد کر سکتے ہیں ۔ اور وہ ایک دن بھی اس لئے یاد کرتے ہیں کہ وہ اپنے پیچھے ایک ہی دن تو چھوڑ جاتے ہیں

" اپنی موت کا دن"

اگر بالفرض انسان اس طرح دنیا سے چلا جاتا جس طرح کوئی شخص دن تاریخ بتائے بغیر چپکے سے کسی سفر پر چلا جائے تو شاید وہ سال میں ایک دن کے لئے بھی یاد نہ آئے۔

اسی لئے انسان کی ساری زندگی میں وہ دن اہم نہیں جس دن وہ اس دنیا میں آتا ہے البتہ وہ دن بلاشبہ نہایت اہم دن ہے۔ جس دن وہ اس دنیا سے

ہمیشہ کے لئے چلا جاتا ہے شاید یہی وجہ ہو کہ دُنیا میں یوم پیدائش منانے کی کوئی رسم اور کوئی ریت نہیں البتہ یوم وفات باالالتزام منایا جاتا ہے جبھی تو دُنیا بھر کے کیلنڈر موت کے دنوں سے بھرے پڑے ہیں۔

سالگرہ کہیں نہیں۔ برسی ہی برسی ہے۔

مرنے والے کو یاد کرنے کے سوائے انسان اور کر بھی کیا سکتا ہے؟ انسان بلاشبہ اتنا طاقتور ہے کہ وہ چاند سیاروں پر بھی کمند پھینک سکتا ہے لیکن وہ اتنا کمزور بھی ہے کہ پانی جیسے آنسو کی بوندیں بھی نہیں روک سکتا۔

وہ اپنے آنسو نہیں روک سکتا تو موت کے فرشتے کے ہمراہ جانے والے کو کیسے روک سکتا ہے؟ اس لئے یہ شکوہ بیکار ہے کہ ہم سال میں صرف ایک بار ہی اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کی یاد کا چراغ جلاتے ہیں۔

مجبور انسان سرِ مزار چراغ جلانے اور قبر پر پھول بکھیرنے کے سوائے اور کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔

لہذا۔ آؤ شاہد احمد دہلوی کی قبر پر نئے چراغ جلائیں اور تازہ پھول بکھیر دیں۔

نظرؔ حیدر آبادی

ایک زمانہ تھا۔

پاکستان میں جتنے بھی یادگار مشاعرے ہوتے نظرؔ حیدر آبادی ان سب میں مائیکروفون کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ نغمہ سرا ہوتا تھا اور اجتماع میں آوازیں گونجتی تھیں۔

" واہ نظر حیدر آبادی "

قبر میں روپوش نظرؔ اب اپنی قبر سے تو نہیں نکل سکتا۔ اب وہ ہمیشہ ہماری آنکھوں سے آنسو بن کر نکلتا رہے گا۔

بھی نظرؔ کا مدفن آنسو ہی تو ہے۔!

نظر حیدر آبادی کو میں نے کوئی ۲۳ سال پہلے اس وقت دیکھا تھا۔ جب جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی آزادی کا کارواں، میر کارواں نواب بہادر یار جنگ کے پیچھے "آج کے پاکستان" کی منزل کی طرف رواں تھا۔

کاروانِ آزادی کی مہار نواب بہادر یار جنگ کے ہاتھ میں تھی اور اس کاروان کو نظر حیدر آبادی کی رجز خوانی تیز گامی عطا کر رہی تھی۔

اس قافلے میں نظر حیدر آبادی سے بڑے شاعر بھی ہوں گے لیکن نواب بہادر یار جنگ کی جوہر شناس نظر نے نظر کو مرکزِ نظر بنا لیا تھا۔ وہ نظر کو کبھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔

چنانچہ ۱۹۴۵ء میں ایک دن جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کے اتحاد کے مرکز "دارالسلام" پر کاروانِ آزادی ـــــ ذرا رکا اور نظر بہادر یار جنگ کو نظر نہ آئے تو انہوں نے دارالسلام کے اسی جلسۂ عام میں ساٹھ ستر ہزار مسلمانوں کے مجمع کو آواز دے کر پوچھا۔

"نظر صاحب کہاں ہیں۔ ؟ نظر نہیں آتے۔ قوم کے نورِ نظر کو یوں روپوش تو نہ ہونا چاہیئے۔"

بہادر یار جنگ کی آواز کا مقناطیس لاکھوں کروڑوں انسان کو کھینچ لاتا تھا تو ایک نظر حیدر آبادی کیا۔!!

چنانچہ نظر حیدر آبادی ڈائس پر آئے۔ سانولا سلونا بڑی بڑی آنکھوں والا

نوجوان نظرؔ۔ میں نے پہلی بار نظرؔ کو نظر بھر کر دیکھا اور اس روز میں نے جی بھر کر نظرؔ کو سُنا۔ ویسے تو نظرؔ ایک نظم پڑھ رہے تھے۔ ویسے تو ان کا ترنم مسحور کن تھا۔ لیکن مجھ پر اور ہزاروں کے مجمع پر بیخودی کا سا عالم طاری تھا۔

آواز کا ایک نیا جادو!

فکر کا ایک نیا چراغ

نظرؔ حیدرآبادی سے یہ پہلا قرب ہی ایک لمبی اٹوٹ دوستی میں بدل گیا لیکن اچانک، ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میں نے سُنا کہ نظرؔ حیدرآبادی مرگیا ہے نظرؔ کی محبت، نظرؔ کی جان اور نظرؔ کی زندگی حیدرآباد تھی۔ چنانچہ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد دکن مرگیا تو نظرؔ حیدرآبادی بھی مرگیا۔

۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کے اس "مرگِ اوّل" سے نظرؔ حیدرآبادی پندرہ سال تک "مرگِ مسلسل" میں روز روز مرتا رہا۔ اور بالآخر ۲۸ اگست ۱۹۶۳ء کو علی الصبح "مرگِ آخر" کو نظرؔ حیدرآبادی پر ترس آ ہی گیا اور اس نے نظرؔ کو روز روز مرنے سے بچالیا۔

ویسے بھی نظرؔ حیدرآبادی خود بھی اس مرگِ مسلسل سے بہت بیزار ہوگیا تھا۔ اور ایک دن تو تڑپ کر اس نے خدا سے پوچھ لیا تھا۔

؎ اے خدا زیستِ غمِ شام و سحر ہے کہ نہیں
تجھ کو اس مرگِ مسلسل کی خبر ہے کہ نہیں

لیکن جب اسے آسمانوں سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے براہِ راست اپنی

"مرگِ آخر" کو آواز دی۔

اے موت دیر کیا ہے میں صرف تیری خاطر
کس کس کو بھول بیٹھا کیا کیا نہ چھوڑ آیا !

حیدر آباد سے کراچی تک نظر حیدر آبادی کی مرگِ اوّل کے سفر میں بھی شریک تھا۔ جب یہ سفر پاک سرزمین پر ختم ہوا تو نظر بہت خوش تھا۔ بہت ہی خوش۔

بہادر یار جنگ کی قیادت میں وہ جس کارواں میں رجز خواں تھا۔ اور جس منزل کی طرف رواں تھا وہ منزل آگئی تھی، کاروانِ آزادی پاکستان پہنچ چکا تھا اور جب کوئی کارواں منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اہلِ کارواں سو جاتے ہیں

غالباً نظر بھی سو گیا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد نظر کبھی کبھی جاگ پڑتا تھا۔ دُنیا میں جہاں کہیں آزادی کی جدوجہد میں غلامی کی ٹوٹتی ہوئی زنجیروں کی چھن چھن گرمج اٹھتی تھی تو نظر جاگ پڑتا تھا۔ چنانچہ انڈونیشیا کی آزادی، مصر کے انقلاب اور الجزائر میں زنجیروں کے ٹوٹنے سے جو آواز پیدا ہوئی نظر نے اس آواز کو اپنے اشعار میں ڈھال لیا۔ چنانچہ ایک بار کراچی میں اسلامی اقتصادی کانفرنس کے موقع پر جو نظم اس نے سُنائی تھی اس کا ترجمہ سُن کر مفتی اعظم فلسطین کراچی کے بھرے جلسے میں تڑپ اُٹھے تھے اور جب نظر نے یہ مصرع پڑھا :۔

ع پھر فلسطین کو کسی فاروق کا ہے انتظار

تو مفتی اعظم فلسطین اپنے آنسو نہ روک سکے اور دوسرے دن مفتی اعظم کے آنسو کراچی کے اخبارات میں پھیل گئے تھے کہ

"AN URDU POET MOVES GRAND MUFTI"

عرصہ گزر گیا۔ لاہور سے آنے کے بعد نظرؔ سے مُلاقات ہوئی تو نظر کو دیکھ کر دل دھک ہو کر رہ گیا۔

کہاں وہ سانولا سلونا، سیاہ گھنے چمکیلے بالوں والا تنومند اور خوشحال نظرؔ — !

اور کہاں یہ سیاہئ غم اور سفید بالوں والا بدحال نظرؔ !!

کیا وہ بہادر یار جنگ کا منظورِ نظر۔ نظرؔ ! اور کہاں یہ گزشتہ پندرہ فلاکت آمیز برسوں کا مرثیہ، نظرؔ !

میں نے آنسو روک کر پوچھا۔

" اتنے برس کہاں تھے ؟ "

وہ روتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولا :-

ے غربت میں وہ بھی قصّہٴ پارینہ بن گئی
شہرت بچا کے لایا تھا اپنے وطن سے میں

اس کے بعد کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ وہ یادوں کا ایک مدفن ہو کر رہ گیا تھا۔ ماضی سے ڈرتا تھا اور اس ڈر کا اظہار بھی کرتا تھا کہ

ے ماضی کی بات وقت سے کرنے لگے نظر
ناگن سے پوچھتے ہو سپیرے کہاں گئے؟

لیکن وہ ماضی کی ناگن کو اپنا لہو پلا پلا کر پالتا بھی رہا، تڑپتا بھی رہا۔ چیختا بھی رہا اور پوچھتا بھی رہا:-

ے کیسے ہیں بادِ صبا، اہلِ چمن میرے بعد
میرے شمشاد میرے سرو سمن میرے بعد
ے کس کے سینے کو میسّر ہے اجنتہ کا گداز
کس کا قبلہ ہے صنم رازِ دکن میرے بعد

ماضی کی ناگن اسے ڈستی رہی، اس کا زہر اس کے جسم میں پھیلتا گیا۔ لیکن یہ زہر اسے لذّت دیتا اور اسی زہر کی سرمستی میں وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا۔

ے یہ یاد ہاں یہ صبحِ بہارِ چمن کی یاد
رشکِ نجوم حلقۂ سرو سمن کی یاد
ے یاروں کی یاد پیاروں کی یاد انجمن کی یاد
مشربِ مدام و تلخیٔ کام و دہن کی یاد

؎ میرے چمن میں رنگِ بہاراں انہی سے ہے
محرابِ دل میں اب بھی چراغاں انہی سے ہے

جی چاہتا تھا کہ نظر کے ہاتھ سے یادوں کے چراغ چھین لوں اور اس کو ٹوک دوں کہ

ع چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

لیکن باہر بھی زہر — اندر بھی زہر — نظر باہر سے بھی زہر پیتا چلا گیا نظر کے اندر بھی زہر پھیلتا ہی چلا گیا۔ مرگِ مسلسل بڑی تیزی کے ساتھ مرگِ آخر کی طرف رواں تھی۔

نظرؔ زندگی بھر کبھی اسپتال نہیں گیا تھا لیکن جب میں نے یہ خبر سُنی کہ نظرؔ جناح اسپتال کے ایک بستر پر لیٹا ہوا ہے تو میں ٹھٹک گیا اور سیدھے جناح اسپتال پہنچا۔

ایک لمحے کے لئے اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور بولا

"دُعا کرو"

اور پھر ایسی آنکھیں بند کرلیں کہ بہت آواز دی لیکن وہ نہ بولا پھر۔ دُعا کیا کرتے۔ ! نظرؔ نے خود ہی تو کہا تھا۔

؎ غریبوں نے کبھی بابِ اثر کھُلتے نہیں دیکھا
دُعاؤں پر توجہ کم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

جو شخص خود دُعاؤں پر توجہ نہ کرتا تھا۔ اب وہ خود ہی دُعاؤں کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں سب کچھ سمجھ گیا۔ اور سامنے نظر کے دونوں بند ہونٹ اس کے اس شعر کے دو مصرعے نظر آ رہے تھے۔

ے لے ہجومِ شکوہ سنجان چھٹ گیا
زندگی خوش ہو کہ ہم تو مر چلے !

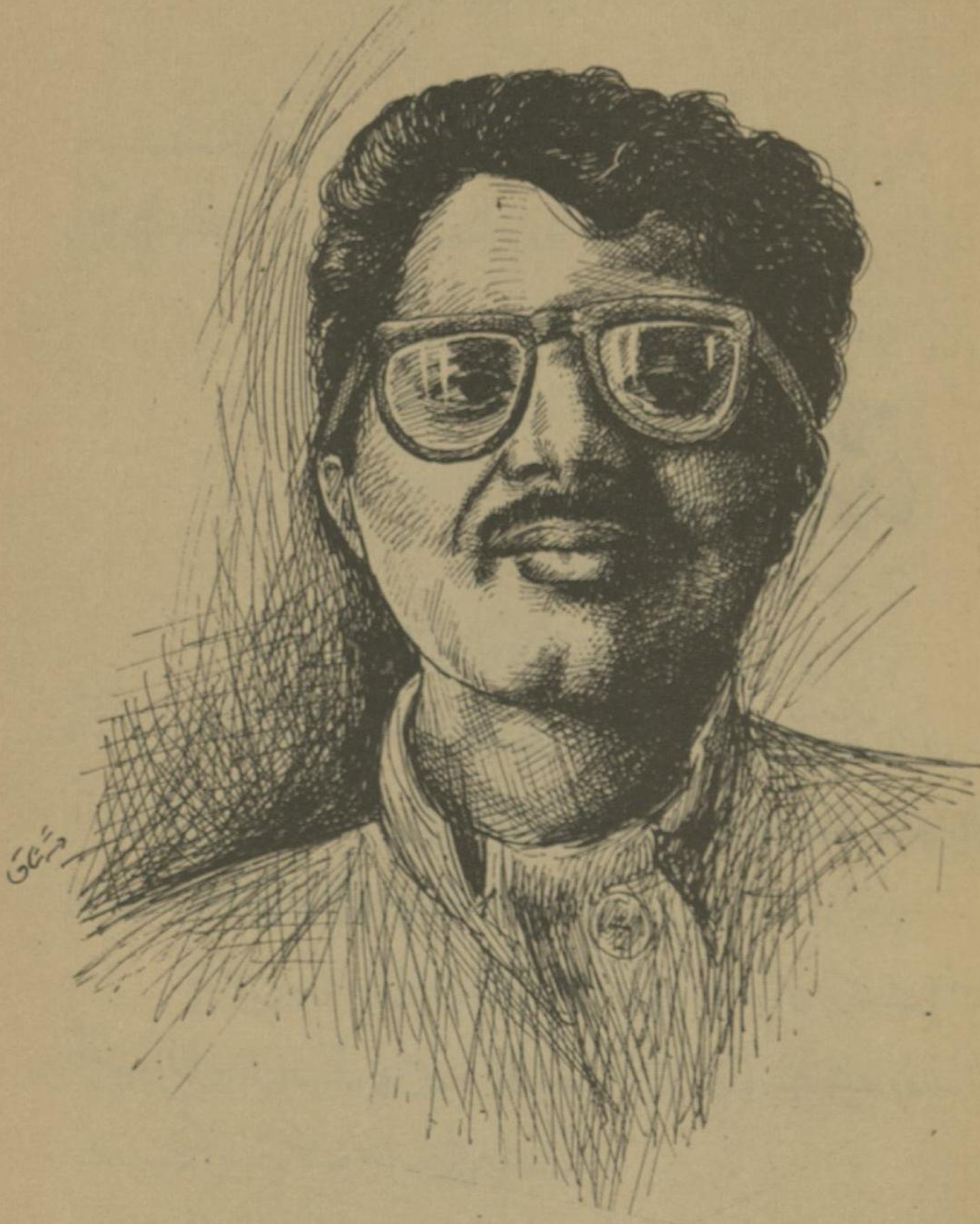
پھر بھی میں نے دُعا کی۔

مگر بابِ اثر نہیں کھُلا

البتہ نظرؔ کے لئے شاید جنّت کا کوئی دروازہ کھُل گیا تھا۔

برسوں پہلے جو آواز بہادر یار جنگ نے لگائی تھی۔ آج میں بھی وہی آواز لگا رہا ہوں۔

" نظر صاحب کہاں ہیں۔ نظر نہیں آتے قوم کے نورِ نظر کو یوں روپوش تو نہ ہونا چاہیئے "



شاہد صدیقی

انسانی زندگی کا راستہ لامتناہی ہے۔ آدم علیہ السّلام کے قدموں سے انسانی زندگی کا جو راستہ زمین پر شروع ہوا ہے وہ دن بدن نئے نئے انسانوں کے قدموں سے لمبا ہی لمبا ہوتا چلا جا رہا ہے۔

پتہ نہیں یہ راستہ کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔ آیا ختم بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ لیکن ہر انسان اس راستے پر ایسی توانائی کے ساتھ چل پڑتا ہے جیسے وہ انسانی زندگی کے راستے کی انتہا تک ضرور پہنچ جائے گا۔

شاہد صدیقی کو بھی جب میں نے زندگی کے راستے پر پہلی بار دیکھا تھا تو اس کی جسمانی صحت اور اس کی معتدل رفتار دیکھ کر میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ

وہ انتہا تک تو نہیں البتہ وہ زندگی کے راستے پر سوسوا سو کوس تک تو ضرور چل سکتا ہے۔

اسی لئے جب اچانک میں نے سُنا کہ وہ صحت مند اور سُبک رفتار شاہد صدیقی صرف اکیانوے سنگ میل پر ہی ہمیشہ کے لئے گر پڑا ہے تو مجھے یقین نہیں آیا۔ کسی کو بھی یقین نہیں آیا۔

اسی لئے میں چیخ پڑا کہ وہ ہمیشہ کے لیئے نہیں گرا ہے۔
صرف تھک کر گرا ہے۔ اسے سہارا دو یارو — وہ
پھر سے اُٹھ کر چل پڑے گا۔
وہ تو ابھی سوسوا سو کوس تک آگے جا سکتا ہے دوستو!

لیکن اخباروں میں تصویر شائع ہوئی ہے کہ یار لوگ اسے سہارا دے کر اُٹھانے کے بجائے اس کا جنازہ اُٹھائے لئے جا رہے ہیں۔

اور صرف شاہد صدیقی کے جنازے کو دیکھ کر یقین کرنا پڑتا ہے کہ واقعی

ع موت کا ایک دن معین ہے۔

انسانی زندگی کے مصنف نے ہر انسان کی زندگی کی کتاب میں جہاں اختتام لکھ دیا ہے وہیں اس کی زندگی کی کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

موت کے لئے بیماری یا حادثہ کوئی ضروری نہیں ایک صحت مند انسان بھی جس میں زندگی کے راستے پر ابھی اور بہت دور تک جانے کی طاقت اور ہمت ہے

وہ بھی موت کی آغوش میں گر سکتا ہے۔ بس ساری بات وقت کی ہے۔ زندگی کے خالق نے جس انسان کو دُنیا میں جتنے وقت کے لئے بھیجا ہے اس سے وہ ایک لمحہ بھی زیادہ نہیں رہ سکتا۔ یہی حقیقت ہے۔ یہی موت ہے۔

شاہد صدیقی کی زندگی اس حقیقت کی تازہ ترین مثال ہے۔ شاہد صدیقی کو دیکھنے والا میری طرح ہر شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کم از کم سو سال ضرور اس دُنیا میں رہے گا۔ اسے اس کی بہت سی "محبتوں" نے بھی سو سال تک جینے کے لئے خلوص دل سے دُعائیں بھی دی ہوں گی۔

لیکن کوئی بھی حتیٰ کہ شاہد صدیقی خود بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زندگی کے اکیانوے سنگ میل ہی پر ہمیشہ کے لئے گر پڑے گا۔

شاہد صدیقی خود بھی واقعی نہیں جانتا تھا۔ ورنہ وہ محبوب حسین جگر سے یہ وعدہ نہ کرتا کہ

میں کل صبح ساڑھے نو بجے دفتر "سیاست" آؤں گا۔

اسے اپنے زندہ رہنے کا پورا یقین تھا اسی لئے اس نے دوسرے دن صبح ساڑھے نو بجے اپنے آنے کا یقین بھی دلایا تھا۔

صبح ساڑھے نو بجنے میں ساڑھے آٹھ گھنٹے باقی تھے کہ اچانک شاہد صدیقی کی زندگی کی گھڑی ایک بج کر پانچ منٹ پر ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی۔

اگر اسے پہلے معلوم ہوتا کہ ایک بج کر پانچ منٹ پر اس کا وقت ہمیشہ کیلئے

ختم ہو جائے گا تو وہ ساڑھے نو بجے کا وقت ہرگز نہ دیتا۔

بھری محفل میں سے کوئی شخص بغیر کسی سے کچھ کہے اچانک محفل سے اُٹھ کر چلا جائے تو اہلِ محفل چونک پڑتے ہیں کہ

خیر تو ہے۔ اسے کیا ہو گیا۔؟

یہ کیوں ایسا اچانک اُٹھ کر چلا گیا ؟

اور ایسے اچانک اُٹھ کر چلے جانے والے پھر لوٹ کر بھی تو نہیں آتے۔!!

شاہد صدیقی بھی اب لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ہم اب اس کی شکل کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ اس کی دلچسپ باتیں کبھی بھی نہیں سُن سکیں گے۔ ہاں البتہ بہت دنوں تک اس کو یاد کر کر کے اس کے متعلق باتیں کرتے رہیں گے۔ لیکن وہ ہماری باتوں کو نہیں سُن سکے گا۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ہم اس کے متعلق باتیں کرتے کرتے تھکتے چلے جائیں گے۔ اور وہ وقت بھی آجائے گا۔ جب ہم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ اور پھر ہم اسے بھول بھی جائیں گے۔

پھر ہمیں شاید یاد بھی نہیں آئے گا۔

ہماری آپ کی زندگیوں میں کتنے ایسے پیارے بچھڑ گئے ہیں کہ جب وہ بچھڑے تو ہمارے ہونٹوں کا تبسم کھو گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

لیکن پھر "وقت" وہ آنسو ایسے پونچھ دیتا ہے کہ پھر اس کے لئے آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں آتا۔

انسان کی زندگی بھی چند روزہ ہوتی ہے اور اس کی یاد بھی چند روزہ۔ جب تک موت تازہ رہتی ہے یاد بھی تازہ رہتی ہے۔ جب موت باسی ہو جاتی ہے تو یاد بھی باسی ہو جاتی ہے۔

جب تک شاہد صدیقی زندہ تھا میں نے اس کے چہرے پر موت کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں دیکھی تھی۔ حالانکہ سُنا ہے کہ ہر انسان کے چہرے پر موت کی پرچھائیں ہوتی ہے۔ اور مشہور بھی یہی ہے کہ انسان بظاہر تو زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوتا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کی عمر بڑھتی رہتی ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کے پیدا ہوتے ہی اس کی عُمر گھٹنی شروع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ پہلے ہی دن سے موت کی منزل کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا ہے۔

مگر میں نے جولائی ۱۹۶۰ء میں شاہد صدیقی کو آخری بار دیکھا تھا۔ اس وقت وہ اپنی موت سے صرف ڈیڑھ سال دور تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر موت کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں تھی۔

حیدرآباد ریلوے اسٹیشن نام پلی کے پلیٹ فارم پر مجھے خیر مقدم کہنے والوں میں میرے بھائیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ شاہد صدیقی بھی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی بھرپور زندگی کی مُسکراہٹ تھی جس نے مجھے اور اس کے سرپرست کو ہمیشہ دھوکا دیا تھا کہ

"موت شاہد صدیقی پر اس وقت تک حملہ نہیں کر سکتی جب تک

کہ شاہد صدیقی کے سر کے سارے بال سفید نہ ہو جائیں اس کی
آنکھیں عینک کی اور اس کے ہاتھ عصا کے محتاج نہ ہو جائیں۔
لیکن موت نے جب اس پر حملہ کیا تو اس کے سارے بال کالے تھے۔
اس کی آنکھوں پر عینک نہیں تھی اور وہ بغیر عصا کے نہایت تیز چلتا تھا۔
لیکن آج ایک بات یاد آتی ہے اور اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ
انسانوں کو اگر شعوری طور پر نہیں تو غیر شعوری طور پر اپنی موت کا احساس
ضرور ہوتا ہے۔
چنانچہ ۱۹۶۰ء میں جب میں پندرہ روز کے لئے حیدرآباد دکن گیا تھا اور
صبح سے شام تک شاہد صدیقی کے ساتھ رہتا تھا۔ ان دنوں شاہد صدیقی نے
یہ شکایت کی تھی کہ

"بہت دنوں سے ایک غزل کہنا چاہتا ہوں۔
صرف مطلع ہوا ہے۔ غزل پوری ہی نہیں ہو پاتی"

اور جب اس نے اپنے مخصوص مزاحیہ فقروں اور موت کو بھگانے والے
قہقہوں کے بعد یہ مطلع سنایا تھا کہ

ے تڑپ الم میں نہیں ہے سکوں خوشی میں نہیں
بہت دنوں سے کوئی لطف زندگی میں نہیں

تو اس وقت تو نہیں بلکہ آج یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاہد صدیقی کو بھی غیر شعوری

طور پر اپنی موت کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔

اب جب شاہد صدیقی کے یہ اشعار کانوں میں گونجتے ہیں :۔

ے میں جینا چاہتا ہوں لذتِ غم کے لئے لیکن
تری مرضی نہیں تو میرا مر جانا بھی آساں ہے

موت سے بہتر نہیں ہے یہ نظام
زندگانی زندگانی کی غلام

رودادِ جُدائی کیا کہیئے اس طرح بھی کچھ دن گزرے ہیں
ہر صبح سے پوچھا ہے میں نے اب اور تو کوئی شام نہیں

چراغوں میں اضافہ کرنے والو
تمہاری روشنی کیوں ہو گئی کم

کہاں وہ صحبتیں اب جن میں روحیں مسکراتی تھیں
ہماری شعر خوانی کیا ہے شاید نوحہ خوانی ہے

اب جبکہ شاہد واقعی اس دُنیا سے چلا گیا ہے ان اشعار میں موت

کے قدموں کی چاپ واضح طور پر اب بھی سُنائی دیتی ہے۔ پہلے بھی ضرور سُنائی دیتی ہو گی۔ لیکن شاہد صدیقی کے پُرشور قہقہوں میں دب کر رہ جاتی ہو گی۔

شاہد کو اپنی موت کا احساس ہو یا نہ ہو۔ لیکن اب اس کے جانے کے بعد ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے یہ اشعار اس شاہد صدیقی کے لئے اب جو مر گیا ہے خود ہی کہے تھے ؎

یہ عالم ہے کہ اُمیدوں کی شمعیں بجھتی جاتی ہیں
اندھیرے زندگی کے بڑھتے جاتے ہیں کہاں ہو تم؟
جنہیں رنگین بنایا تھا تمھاری جنبش لب نے
وہ نغمے وہ ترانے یاد آتے ہیں کہاں ہو تم؟

دیکھ یہ دُنیا وہی اور وہی اس کی بہار
اے نگاہیں پھیرنے والے تجھے کیا ہو گیا

فضائے صبح چمن اس کے بعد ویراں ہے
پُکارتی ہیں کلیاں چلا گیا کوئی

مجھے یقین ہے کہ خداوند تعالےٰ نے شاہد صدیقی کو حورانِ خلد کی زُلفوں

کی چھاؤں عطا کی ہوگی۔ کیونکہ وہ گُناہِ عشق کا مرتکب تھا اور اس کا یہ عقیدہ تھا کہ صرف اسی شخص کی نجات روزِ حشر ممکن ہے جسے گناہِ عشق نے دُنیا میں آدمی بنایا ہو۔ اسی بات کو خوبصورت انداز میں اس نے یوں کہا تھا۔

ے مجھے تو حشر تک اس کی نجات میں شک ہے
گناہِ عشق جیسے آدمی بنا نہ سکا۔

مگر سوچتا ہوں کہ شاہد کو خلد میں میرؔ و غالبؔ اقبالؔ اور جگرؔ اخترؔ شیرانی اور مجازؔ جیسے دوستوں کی نعمتیں مل جانے کے بعد بھی سکون و قرار کیسے میسّر آسکے گا؟ کیونکہ شاہدؔ نے زمین ہی پر خُدا کو یہ اطلاع دیدی تھی کہ

ے مجھے راس آسکے گی نہ فضائے خلد یارب
نہ وہ بیکسوں کی دُنیا نہ وہ غم زدوں کی بستی

بیکسوں اور غم زدوں کا یہ جانثار عاشق بیکسوں کی دُنیا اور غم زدوں کی بستی ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

اپنی اکاون سالہ زندگی میں اس نے ایک ہی چراغ منزل جلایا تھا سو وہ چراغ منزل ابھی تک فروزاں ہے۔

"شاہد تو حیدر آباد دکن کی ایرانی گلی میں رواں دواں تھا۔ لیکن اس کا "چراغ منزل" تو زندگی کی منزل کے راستے پر فروزاں ہے۔

شاہد صدیقی تو ہمیشہ کے لئے اس دُنیا میں نہیں رہ سکا۔ البتہ اس کا "چراغ منزل" ہمیشہ ہمیشہ فروزاں رہے گا۔ اور جب تک یہ چراغ جلتا رہے گا شاہد صدیقی کی یاد بھی فروزاں رہے گی۔

عجب واقعہ ہے عجب نظارہ ہے۔

شاہد صدیقی مر بھی گیا ہے

شاہد صدیقی زندہ بھی ہے

ظریف جبلپوری

اب تک تو وہ تقریب بھی ختم ہوگئی ہوگی جو آسمان پر جنت میں حضرت ظریف جبلپوری کی آمد کی خوشی میں ان کے استقبال کے لئے منعقد کی گئی ہوگی۔!

اب تک تو ظریف جبل پوری جنت میں اپنے کمرے میں منتقل بھی ہو گئے ہوں گے اور ظریف کے پیارے دوست شوکت تھانوی، ادیب سہارن پوری، شاہد صدیقی نظر حیدر آبادی اور دوسرے دوست اور رشتہ دار انہیں گھیرے بیٹھے ہوں گے اور ظریف ان کے آگے ہاتھ جوڑ رہے ہوں گے۔

"یارو۔ ایک دنیا سے دوسری دنیا کا سفر طے کر کے آیا ہوں بہت تھک گیا ہوں کچھ دیر سستانے اور آرام تو لینے دو۔"

لیکن ہر دوست یہی کہہ رہا ہوگا کہ

"نہیں نہیں، آرام بعد میں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ

ع کیسے ہیں اہلِ چمن اہلِ وطن میرے بعد ؟"

اور یہ سوال سُن کر معاً ظریف جبلپوری کے چہرے سے پُرانے بچھڑے دوستوں سے ملنے کی ساری خوشی غائب ہوگئی ہوگی۔ اور وہ جنت کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے زمین پر اپنی بیوی اور اپنے بچوں اور دوستوں کو ڈھونڈ رہے ہوں گے اور سوال کا جواب دینے کے بجائے خود ان کے ہونٹوں پر یہ سوال ہوگا کہ ہاں، ہاں۔

ع کیسے ہیں اہلِ چمن اہلِ وطن میرے بعد

میرے شمشاد میرے سرو سمن میرے بعد

یکم مارچ ۶۴ء کی شام میں جنگ کے دفتر سے باہر نکل رہا تھا کہ ایک غمگین چہرے والے نوجوان نے مجھے روکا اور بڑے کراہتے ہوتے لہجہ میں بولا :-

"جلیس صاحب — ابھی کچھ دیر پہلے ظریف جبلپوری صاحب کا اچانک انتقال ہوگیا۔ ؟"

میں جیسے چیخ پڑا۔

" کیا کہا — ؟"

وہ نوجوان رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"میں ظریف صاحب کا بھانجا ہوں ....."

میں نے صرف اتنا ہی سُنا۔ اس کے بعد نہ جانے وہ کیا کیا کہتا رہا۔ اور جانے میں اس کے سامنے کھڑے ہونے کے باوجود کہاں تھا۔؟

بڑی دیر بعد ویران خانہ دل سے ایک لمبی ٹھنڈی سانس گونجتی ہوئی گزر گئی

اچھا۔ خدا حافظ ظریف جبلپوری !

ظریف مرحوم میرے گہرے دوست تو نہ تھے البتہ بہت پیارے دوست ضرور تھے۔ مہینوں ان سے ملاقات نہ ہوتی۔ لیکن جب کبھی بھی ملاقات ہوتی تو ایسی بے تکلفی کی باتیں ہوتیں جیسے ہم روز کے ملنے والے ہیں اور حسب معمول ملے ہیں۔

ان سے آخری ملاقات بھی مہینوں پہلے ہوئی تھی۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۳ء کی شام سنیٹرل ہوٹل میں بیگم طیبہ محسن صدیقی کے رسالے "محور" کی افتتاحی تقریب تھی، حضرت سراج الدین ظفر، حضرت جمیل الدین عالی حضرت اطہر نفیس، افتخار چودھری اور میں ایک طرف بیٹھے تھے۔ محفل پر خاصی سنجیدگی طاری تھی کہ اچانک ایک مانوس قہقہہ گونجا اور ظریف جبلپوری ہمارے درمیان تھے۔ اب ہنسنے ہنسانے کا دور شروع ہو چکا تھا ظریف کی باتیں اور ظریف کے شعر ہی نشاط انگیز نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کی ہر چیز تبسم آفریں ہوتی تھی۔

چنانچہ انہوں نے ایک بڑا ننھا منا عجیب و غریب سگریٹ کیس نکالا اور اسے کھولا تو اس میں سگریٹوں کے بجائے آدھی آدھی سگریٹیں یعنی ٹوٹے رکھے ہوئے تھے بولے :۔

"تم نے میری نظمیں ٹیڈی گرل اور ٹیڈی بوائے تو سُنی ہیں۔

اب ذرا "یہ ٹیڈی سگریٹ کیس" دیکھو اور یہ ٹیڈی سگریٹ پیو۔"

پھر بڑے آزردہ لہجے میں بولے :۔

"کیا بتاؤں بھائی ۔ اس "بیماریٔ دل" نے بڑا عاجز کر رکھا ہے ڈاکٹر نے میری سگریٹ نوشی پر بھی پابندی عائد کر دی ہے' اب تو "ٹیڈی سگریٹوں" کے سہارے جی رہا ہوں۔ پتہ نہیں کب تک جیوں ؟"

اطہر نفیس نے کہا :۔

اطمینان رکھئے ظریف صاحب !

" زندہ دل خوب جیا کرتے ہیں "

ظریف جبلپوری زندہ دل تھے۔ ان کا شمار اہل دل میں تھا۔ وہ دل ہی کے بیمار تھے۔ پرائیویٹ ڈاکٹروں سے بھی علاج کروایا۔ سرکاری ہسپتالوں میں بھی زیر علاج رہے۔ ہر تدبیر کی' ہر دوا پی لیکن

ے الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

ظریف مرحوم نے مجھے زندگی میں صرف ایک ہی خط لکھا اور اس میں یہ صراحت کی تھی کہ "آپ کو پہلی بار خط لکھ رہا ہوں"۔ اور پھر یہ تاکید کی تھی کہ اس کو اپنے فکاہی کالم میں شائع نہ کروں۔

"مجھے کیا پتہ تھا کہ ان کا وہ پہلا ہی خط آخری ہوگا۔! اب میں تبرکاً ان کا خط شائع کر رہا ہوں اور ان کی ہدایت کے مطابق فکاہی کالم میں نہیں بلکہ ان کے نام الوداعی کالم میں۔ حضرت شوکت تھانوی کو ہم سب سے روٹھے زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ اچانک ظریف مرحوم کا مکتوب وصول ہوا۔

جلیس بھائی۔ سلام مسنون :۔

غالباً نہیں بلکہ یقیناً پہلی بار خط لکھ رہا ہوں آپ کو اس لئے نہیں کہ آپ اس کو فکاہی کالم میں شائع کریں۔ معاملہ سنجیدہ ہے۔

میں نے شوکت بھائی کی وفات پر چند تاریخی قطعات اور رباعیات ۸ رمئی ۶۳ء کو میر جمیل الرحمٰن صاحب کی خدمت میں راولپنڈی ارسال کئے تھے اور یہ گزارش بھی کی تھی کہ کراچی کے جنگ میں بھی اشاعت کا انتظام فرمادیں۔ آج ۲۲ رمئی ہوگئی۔ مگر ہنوز ایک قطعہ یا رُباعی کسی جنگ میں شائع نہیں کیا گیا۔ مجھے اس غیر متوقع روّیہ کا بہت صدمہ ہوا پھر معاً یہی خیال آیا کہ میرا ۱۹ سالہ پُرانا ساتھی شوکت مرحوم ہو گیا۔ اور وہی اپنی زندگی میں تقاضہ کر کے ڈانٹ ڈپٹ کر نظمیں وغیرہ حاصل کر کے جنگ میں شائع کیا کرتا تھا۔ وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اب مجھے کون پوچھتا ہے۔ ؟

بہرحال آپ کی خدمت میں منسلکہ قطعات اور رباعیات

ارسال کر رہا ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنے کالم وغیرہ وغیرہ میں شائع کر دیں کہ شوکت کے انتقال کے بعد میرا شمار "وغیرہ" ہی میں ہے۔ تکلیف دہی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

مخلص

ظریف جبلپوری

میں نے اس خط کا جواب اس طرح دیا تھا کہ ان کے حکم کی تعمیل کر دی تھی۔ لیکن کون جانتا تھا کہ شوکت مرحوم کے تعزیتی قطعات شائع کرنے کے علاوہ ظریف صاحب کے انتقال کی خبر بھی چھاپنی پڑے گی۔

واقعی کون جانتا تھا کہ

ے وہ جس کی بات بات پر ہنستے تھے اہل بزم
جو خود نہ رو سکا تو سبھوں کو رُلا گیا

حاجی لق لق

اب تک تو ہم اسے محض اتفاق سمجھتے رہے لیکن اب ہمیں یقین ہو گیا کہ اُردو صحافت کے فکاہی کالم نویسوں کے لئے مہینے کی ۲۷ تاریخ واقعی نہایت منحوس بلکہ مہلک ہے۔

اس منحوس تاریخ کو اُردو صحافت کے چار عظیم مزاح نویس ہم سے ہمیشہ کیلئے بچھڑ گئے۔

۲۷ جون ۵۵ء کو مولانا چراغ حسن حسرت

۲۷ جون ۵۷ء کو مجید لاہوری۔

۲۷ ستمبر ۵۹ء کو مولانا عبدالمجید سالک

اور اب ۲۷ ستمبر ۱۹۶۱ء کو حاجی لق لق

جو۔ جب تک زندہ رہے ہر صبح سویرے ہمارے ہونٹوں کے لئے مسکراہٹیں اور ہمارے دل کے لئے خوشیاں لاتے رہے۔

جو۔ زندگی بھر خود مغموم رہے، اپنے آنسو چھپا چھپا کر روتے رہے مگر جنھوں نے اپنے مزاج سے دوسروں کی آنکھوں میں آنسو نہ آنے دیئے یا ان کے آنسو پونچھ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دیں۔

خود رو کر دوسروں کو ہنسانا انسان کی بہت بڑی خدمت ہے اور انسان کی خدمت خدا کی بہت بڑی عبادت ہے۔

حاجی لق لق مرحوم بھی خدا کے ایسے ہی عابد بندوں میں سے ایک تھے۔

انہوں نے خدا کے بندوں کی خوش حالی کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دی۔ لیکن زندگی بھر وہ خود خوشحال نہ رہ سکے۔ ان کی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم سے ہوا وہ فوج میں کلرک کی آسامی پر مامور رہے۔ لیکن "فوج" میں بھی "موج" کی زندگی انہیں میسر نہ آسکی۔ بارہ پندرہ سال ہندوستان سے باہر رہنے کے بعد وہ ہندوستان اور پاکستان کی صحافت سے متعلق ہو گئے۔ ان کی صحافت اوروں کے لئے تو باعث لطافت تھی، لیکن ان کی اپنی زندگی میں کوئی لطافت پیدا نہ ہو سکی۔ ان کی زندگی کے آخری دن تو نہایت عسرت اور تنگدستی میں گزرے۔ اس حقیقت کا اعتراف لق لق نے خود اس طرح کیا ہے۔

ع لق لق زمانہ ہم سے اُٹھاتا ہے فائدے
ہم نے نہ کچھ اٹھایا زمانے سے فائدہ

اور دُنیا سے جانے سے چند گھنٹے پہلے بھی انہوں نے بڑے درد اور بڑی حسرت کے ساتھ اپنی آخری روانگی کا اس طرح تذکرہ کیا :-

ع دارِ فانی سے چل دیا لق لق
لو یہ قصّہ بھی آج ختم ہوا

کتابوں میں پڑھا ہے آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا ہے کہ "ہر مزاح نگار کا انجام بڑا دردناک ہوتا ہے"۔ ایک انگریز مزاح نگار (جس کا نام اس وقت میں بھول رہا ہوں) کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ ڈاکٹر لوگ جب بھی کسی دِق کے مریض کے لئے دوائیوں کا نسخہ تحریر کرتے تھے اس میں اس مزاح نگار (فرض کیجئے کہ اُس کا نام الف تھا) کی کتابیں بھی بطورِ دوا نسخے میں لکھ دیا کرتے تھے۔ یعنی

"فلاں فلاں دوائیاں اور انجکشن اور الف کی دو یا تین کتابیں"

ایک دن ڈاکٹر کے پاس دِق کا ایک خطرناک مریض آیا ڈاکٹر نے نسخے میں دوائیاں لکھنے کے بعد مزاح نگار الف کی بھی چار کتابیں لکھ دیں اور اس کے بعد مریض سے نام پوچھا تو مریض نے بڑی طنزیہ مُسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"میرا نام الف ہے اور میں ہی وہ مشہور مزاح نگار ہوں

جس کی چار کتابیں بطور دوا کے آپ نے نسخے میں لکھی ہیں "۔

"خدا ہمارا انجام بخیر کرے"۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو کے مزاح نگاروں میں بیشتر کا انجام واقعی بڑا دردناک رہا ہے۔ انشاء اللہ خاں انشا سے لے کر حاجی لق لق تک دُنیا کو ہنسانے والے دُنیا سے روتے ہوتے ہی اُٹھے۔

میرا شمار ان کے دوستوں میں نہیں البتہ ملاقاتیوں میں ہے۔ آخری بار میں ان سے لاہور میں اسی سال، ۷ اپریل کو ملا تھا۔ ان سے پہلی ملاقات میں دل خوش ہوا تھا۔ اور آخری ملاقات میں رونا آگیا تھا۔ اُس وقت وہ حاجی لق لق نہ تھے بلکہ صرف "عطا محمد چشتی" رہ گئے تھے۔

گویا لطیفہ۔ لطیفہ نہ رہا تھا "مرثیہ" بن گیا تھا۔

اب ہم تبرکاً ان کے ایک مشہور مضمون "متحرک مشاعرے" کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

لائلپور میں مشاعرہ تھا اور لاہور سے بذریعہ موٹر لاری حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری، حضرت اختر شیرانی، الطاف مشہدی اور حاجی لق لق کی تحریک پر لاری ہی میں ایک مشاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ طرح مصرع سوچا جا رہا تھا کہ ایک مسافر نے الطاف مشہدی سے کہا :۔

بابو جی۔ ماچس دینا۔

یہ سننا تھا کہ سارے شاعر پھڑک اُٹھے اور حاجی لق لق نے کہا کہ :" لو مصرع طرح ہو گیا۔

ع "ازراہ لطف و کرم بابو جی ماچس دینا"

پس پھر مشاعرہ ہو گیا۔ حفیظ جالندھری نے گرہ لگائی

ے بزم اُردو میں نئی شمع جلانا ہے مجھے
ازراہ لطف و کرم بابو جی ماچس دینا

اختر شیرانی نے دوسرا شعر پیش کیا۔

ے درجۂ سکرِ شراب اس کو جلا کر دیکھیں
ازراہ لطف و کرم بابو جی ماچس دینا

اس کے بعد مشاعرہ کے دوسرے دور کا یہ طرح مصرع پیش ہوا

ع مصیبت ہے کہ ہم گرمی میں لائلپور جاتے ہیں

حضرت حفیظ جالندھری نے فرمایا :۔

ے نکل کر باغ رضواں سے سوئے تنور جاتے ہیں
مصیبت ہے کہ ہم گرمی میں لائلپور جاتے ہیں

اختر شیرانی نے کہا :۔

تلاشِ جلوۂ سلمیٰ میں سوئے طور جاتے ہیں
مصیبت ہے کہ ہم گرمی میں لائلپور جاتے ہیں

الطاف مشہدی کا شعر یہ تھا :-

ے ہیں کچھ صوفی بھی ہم ہیں اور کچھ مخمور جاتے ہیں

اس پر حاجی لق لق نے کہا :-

نیا مصرع کہنے کے بجائے الطاف صاحب کے مصرع میں اس طرح ترمیم کرنا چاہتا ہوں کہ :-

ے ہیں کچھ انسان بھی ہم اور کچھ لنگور جاتے ہیں
مصیبت ہے کہ ہم گرمی میں لائلپور جاتے ہیں

لاری قہقہوں سے گونج اُٹھی۔ سب سے زیادہ محظوظ لاری کا ڈرائیور ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب یہ متحرک مشاعرہ لائلپور کے لاریوں کے اڈے پر ختم ہوا تو اختر شیرانی نے سکھ ڈرائیور کو الوداع کہتے ہوئے یہ شعر پڑھا :-

ے اب تو لاری سے جا رہے ہیں سکھ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

شاعروں کی صحبت میں سکھ ڈرائیور کی رگِ شعر بھی پھڑک اُٹھی اور اس نے پنجابی شعر میں جواب دیا۔

یار ہون گے ملن گے آپے
پیچھے پیچھے کی نسناں

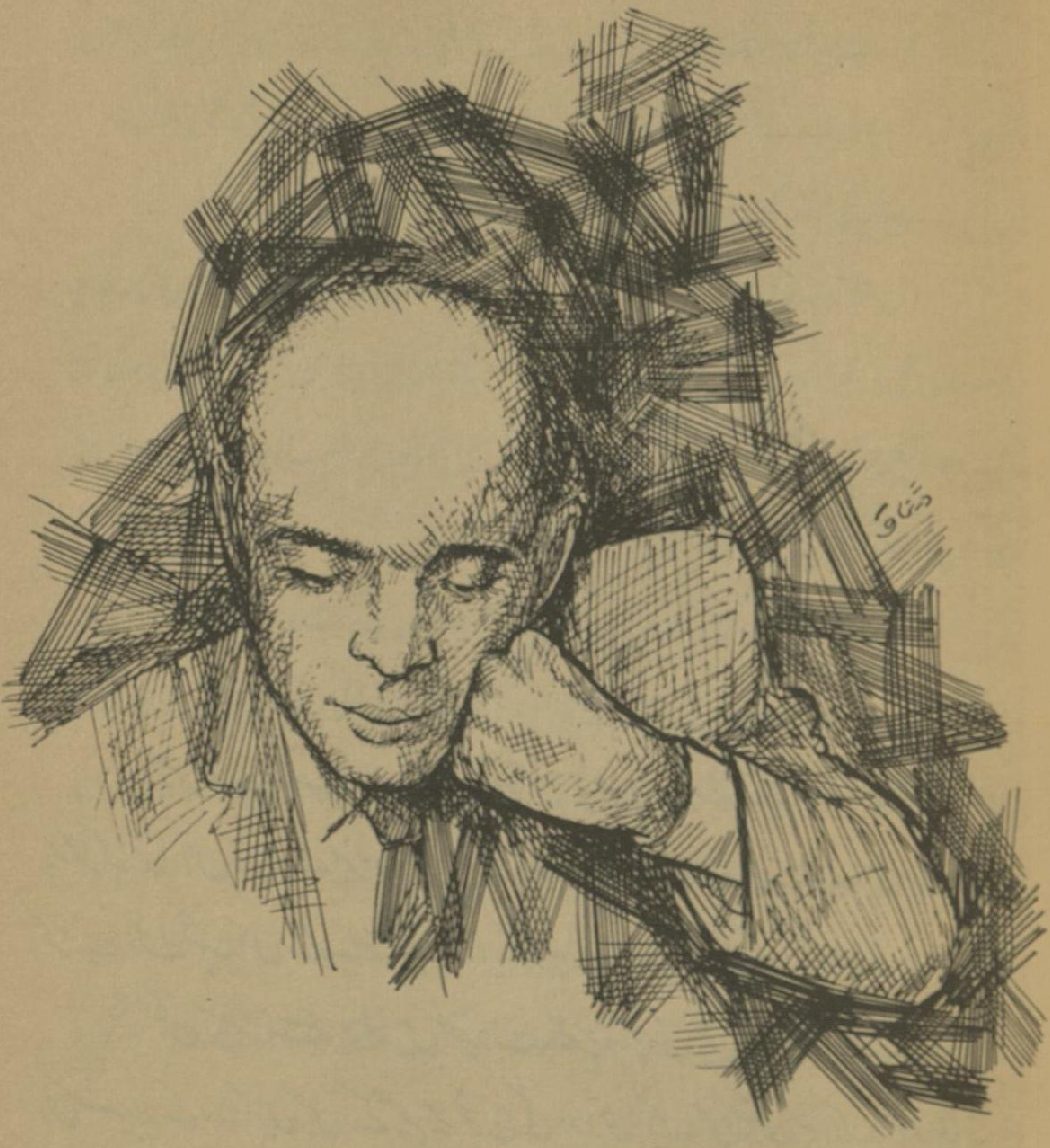
یار زندہ ہوں گے تو آپس میں ملیں گے، پیچھے پیچھے کیا دوڑنا۔

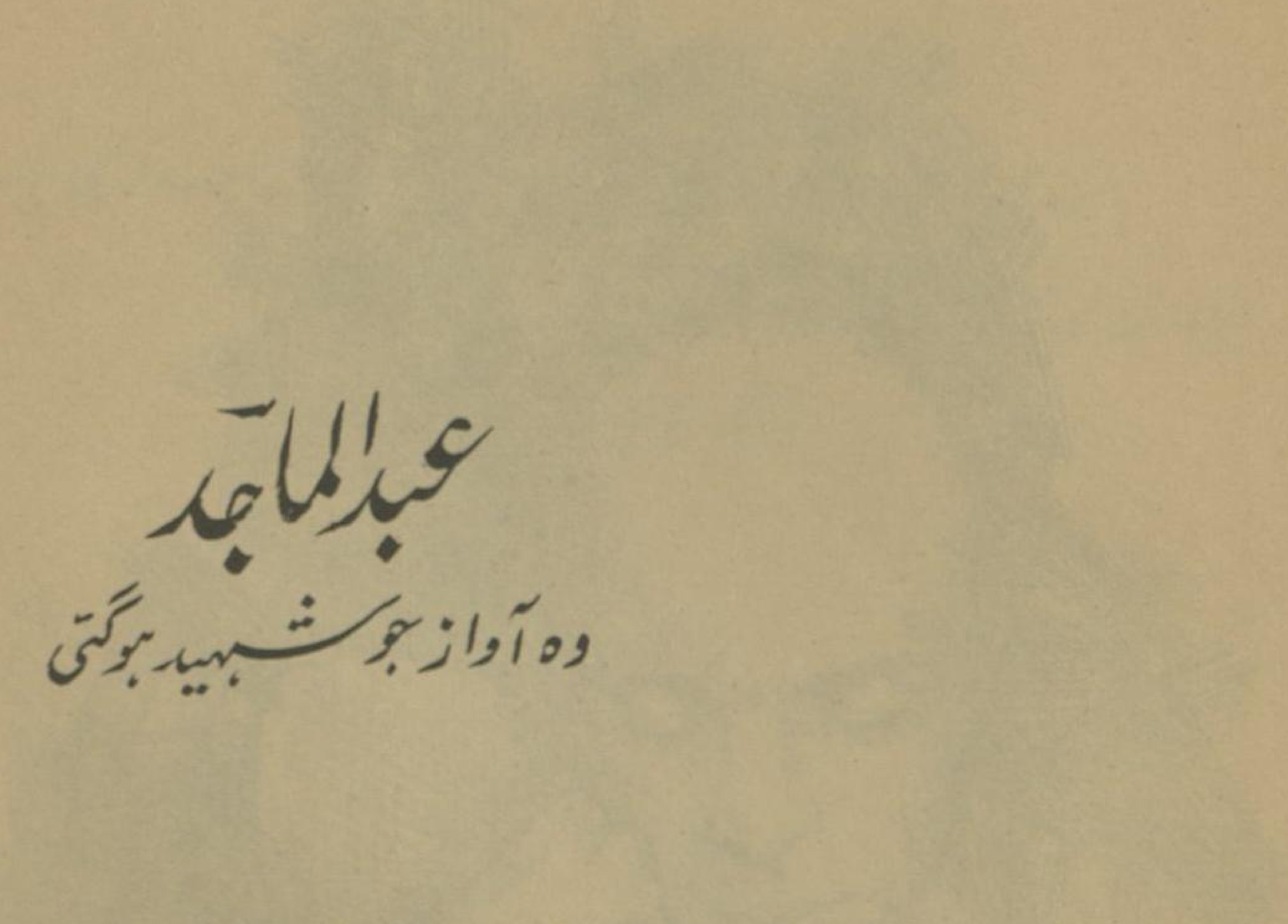
مگر افسوس کہ یاروں کا یار حاجی لق لق

ع دارِ فانی سے چل دیا لق لق

اب ہم بھی اسے الوداع کہہ کر لوٹ آئیں۔ جب ہم سب کو بھی ایک نہ ایک دن لق لق کے پیچھے جانا ہی ہے تو پھر

پیچھے پیچھے کی نسناں





عبدالماجد

وہ آواز جو شہید ہوگئی

جس دن پاکستان کے جانی دشمن بزدل ہمسایہ بھارت نے اچانک پاکستان پر حملہ کیا تھا۔اس دن سے ہر روز میں اپنے مقدس وطن پاکستان پر سے اپنی جان نچھاور کر دینے والے شہیدوں کے لئے عقیدت کے پھول لئے میدان جنگ کی طرف جاتا رہا ہوں۔

لیکن آج میرے ہاتھ میں عقیدت کے چند پھول ہیں یہ عقیدت کے پھول اس شہید کے لئے ہیں جس کے جسم پر فوج کی وردی نہیں تھی لیکن جو ایک اور محاذ جنگ پر پاکستان کے دشمنوں سے برسرپیکار شہید ہوگیا۔

یہ شہید ریڈیو پاکستان کا منفرد صداکار۔ فلم اور اسٹیج کا ممتاز اداکار، پاکستان کا نامور قلمکار جواں سال اور جواں مرگ عبدالماجد تھا۔

بھارت سے جنگ صرف میدان ہی میں نہیں ہوئی انحادی انجمن کے ایوان میں ہوئی۔ اخبارات کے صفحات پر بھی ہوئی اور ریڈیو کے مائیکروفون پر بھی ہوئی۔

ریڈیو کا محاذ بھی ایسا گرم محاذِ جنگ تھا جیسا کہ میدان کا محاذِ جنگ،

اس محاذ کے اور مجاہدوں کو میں نہیں جانتا۔ البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ ریڈیو پاکستان کا مائیکروفون جب ماجد کے سامنے آجاتا تھا تو ایسا ہی آتش نفس ہو جاتا تھا جیسے وہ مائیکروفون پر نہیں بلکہ اپنے وطن کی مقدس سرحد پر ایستادہ ہر پاک سپاہی کی آتش فشاں مشین گن ہے۔

توپ اور مشین گن کے گولے تو صرف سرحدوں پر گرجتے برستے تھے لیکن ماجد کی آواز سارے بھارت میں ایسی گرجتی اور گونجتی تھی کہ سارا ارضِ ہمالہ لرز جاتا تھا۔

لیکن ۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کی منحوس صبح اچانک یہ آواز بند ہو گئی۔ اور ساتھ ہی ریڈیو پاکستان سے یہ اعلان بھی ہو گیا کہ

"یہ آواز مر گئی۔ یہ آواز شہید ہو گئی"

یہ اعلان سُن کر میں دم بخود ہو گیا۔ مجھ پر بھی ایک سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ ماجد کی آواز جو اچانک ساکت ہو گئی تھی۔!!

تھوڑی دیر کے بعد میرے دوست مرزا ظفر الحسن کا ٹیلیفون آیا انہوں نے بتایا کہ

"ماجد بجلی کے شاک سے ہلاک ہو گئے"

لیکن یہ بجلی کہاں سے آگئی۔؟ شہر میں تو بلیک آؤٹ تھا۔ شہر میں تو بجلی نہیں

تھی۔ اگر شہر میں بجلی تھی تو کیا وہ صرف ماجد کی جان لینے کے لئے ہی باقی رہ گئی تھی!

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جو بجلی ماجد کی زندگی تھی وہی بجلی ماجد کی موت بھی تھی!

ماجد فطرتاً برق صفت تھا۔ وہ ادب، اسٹیج فلم اور ریڈیو کے اُفق پر بجلی کی طرح چمکا۔ اور بجلی ہی کی طرح تیزی سے کوند گیا۔

ماجد کی عمر بہت چھوٹی تھی۔ لیکن زندگی بہت بڑی بالکل بجلی کے کوندے کی طرح۔

بجلی کا کوندا لمحہ بھر کے لئے لپکتا ہے لیکن سارے عالم کو چکا چوند کر دیتا ہے۔

ماجد کی عمر بھی صرف ۳۵-۳۶ سال تھی لیکن اتنی مختصر سی زندگی میں بھی جیسے اس نے سو برس کی شہرت اور ناموری سمیٹ لی تھی۔

ماجد سے میری پہلی ملاقات کوئی بیس اکیس برس پہلے حیدرآباد دکن میں ہوئی تھی، ماجد اس وقت ۱۷، ۱۸ برس کا لڑکا تھا لیکن اس کی شخصیت میں کچھ ایسی مقناطیسی تھی کہ پہلی ہی ملاقات گہری دوستی بن گئی۔

میں اور ماجد نہ صرف ہم محلہ تھے بلکہ ہم پیشہ بھی یعنی میں بھی حیدرآباد ریڈیو سے وابستہ تھا اور ماجد بھی۔ ہم دونوں اکثر ریڈیو اسٹیشن جاتے اور ساتھ ہی گھر لوٹتے۔

اُن دنوں ماجد فقط آواز تھا۔ یعنی ریڈیائی ڈراموں کا ایک صداکار لیکن ایک دن ماجد نے بہت شرماتے لجاتے مجھ سے کہا کہ

"میں نے یہ ریڈیائی ڈرامہ لکھا ہے ذرا اسے ایک نظر دیکھ لینا"

میں نے پہلے تو سرسری نظر سے اس کا ڈرامہ دیکھا اور ایک دم چونک کر گہری نظر سے پڑھنے لگا۔

اور پھر اس کے بعد میں نے بڑی معنی خیز اور بڑی استفہامیہ نظروں سے ماجد کو دیکھا۔ ماجد نے شرما کر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

مجنوں دیوارِ دبستان پہ لام الف لکھتا تھا اور اس لام الف میں مجنوں کا سارا دل دھڑکتا تھا۔

ماجد نے ریڈیو کے لئے ڈرامہ لکھا تھا اور اس ڈرامے میں بھی اس کے نوجوان دل کی ساری دھڑکنیں گونج رہی تھیں۔

عشق نے ابراہیمؑ کو پیغمبر بنا دیا تھا۔ اور عشق نے ماجد کو صداکار سے فن کار قلمکار بنا دیا تھا۔

ماجد کا عشق بھی صادق تھا، چنانچہ بہت ہی جلد اس کا عشق عروسی گھونگٹ کاڑھے سُرخ ڈولی میں سوار اس کے گھر کا اُجالا بن گیا۔

وہ اُجالا اجواب ماجد کی جوان موت کے دھوئیں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دُھندلا گیا ہے۔

خیال طبیعت اور پیشہ۔ ماجد صرف ان تین راستوں ہی پر میرا ہم سفر نہیں تھا بلکہ ہم نے زندگی میں ایک بار اکٹھے ریل کا سفر بھی کیا تھا۔

ریاست حیدرآباد دکن پر بھارتی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہاں بھی ماجد بھارتی

فوجوں کے خلاف ریڈیو کے محاذ کا ایک نامور مجاہد تھا۔ غالباً اسی لئے اس کے خلاف بھی گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ اور ماجد بھی بھارت کی سامراجی حکومت کی غلامی پر موت کو ترجیح دیتا تھا۔

اس زمانے میں حیدر آباد سے بمبئی اور بمبئی سے پاکستان تک کا سفر موت کے سفر سے کسی طرح کم نہ تھا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ، جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا کے غنڈے ٹرینوں پر حملے کرتے اور مسلمانوں کو چُن چُن کر قتل کرتے تھے۔

اس کے باوجود ایک دن میں، نظر حیدر آبادی مرحوم، خواجہ معین الدین، مصطفےٰ اعلیٰ ماجد کے بڑے بھائی قیوم عارف، ماجد اور ماجد کی دُلہن بمبئی جانے والی ایک ٹرین میں سوار ہو گئے کہ

بھارتی سامراجی غلامی سے موت بہتر۔

"مرنا ہی ہے تو پھر اکٹھے مریں گے"۔

لیکن ہم سب کی قسمت میں زندگی کی سرزمین پاکستان کا نام تحریر تھا۔

ہم سب بہت خوش پاکستان پہنچ گئے۔

ماجد اور میں اکٹھے پاکستان پہنچے تھے۔ لیکن پاکستان پہنچ کر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ماجد کو ریڈیو پاکستان میں ملازمت مل گئی تھی اور مجھ پر ریڈیو پاکستان کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔

ماجد سے گھر پر ملاقات بھی مشکل تھی۔ کیونکہ ریڈیو پاکستان بھی ماجد کا گھر ہی تھا۔

مہینوں برسوں میں کبھی کبھار ماجد سے سرسری ملاقات ہو جاتی تھی' اس لئے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ماجد کیسا ہے اور کس حال میں ہے۔؟

میں ریڈیو سے خبروں اور اہم تقریروں کے علاوہ کچھ نہیں سُنتا اس لئے میں ماجد کی آواز سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ صرف ہمارے مشترک دوستوں سے ماجد کی خیر وعافیت معلوم ہو جاتی تھی۔

ماجد کے انتقال سے صرف چند دن پہلے ابراہیم نفیس سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ماجد کار کے ایک حادثے میں زخمی ہو گئے۔ پتہ نہیں کیوں میں نے ماجد کے زخمی ہونے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ اور ماجد کے کار خریدنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ماجد کی زندگی میں اب صرف موٹر کار کی کمی باقی رہ گئی تھی۔ سو وہ بھی پوری ہو گئی۔ ورنہ تو وہ صداکار' اداکار اور قلمکار پہلے ہی سے تھا۔!"

لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ بڑے چاؤ سے خریدی ہوئی کار اور کار جہاں دونوں سے اس کا دل اتنی جلدی بھر جائے گا۔!

سارے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں ماجد کے جنازے اور تدفین میں کیوں شریک نہیں ہوا۔؟

میں اس سوال کا اس لئے کوئی جواب نہیں دیتا کہ میں اپنے کسی بھی پیارے کو زندہ اپنے کندھے پر اُٹھانے کے لئے تو بخوشی تیار ہوں لیکن میں اپنے کسی پیارے کی لاش کو کندھا دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔

کیونکہ پیار کبھی نہیں مرتا۔

ماجد زمین پر اب مجھے کبھی نہیں ملے گا لیکن وہ جہاں بھی ہے میرے لئے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

عرش تیموری

عرش تیموری کی وفات کو کئی سال ہو چکے ہیں مگر ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی میں اپنے بہت ہی پیارے دوست اور دفتر کے دیرینہ ساتھی عرش تیموری کو دُنیا کے آخری دروازے پر ہمیشہ کے لئے خدا کی حفاظت میں سونپ کر اور اسے آخری بار الوداع کہہ کر لوٹ آیا ہوں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اور ہم سب دوستوں نے اپنے پیارے دوست عرش کو اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھا تھا۔

کیا مرنا بھی کوئی بڑی دلیری، فتح اور مسرت کا کارنامہ ہے کہ لوگ مرنے والے کو کندھوں پر اُٹھا لیتے ہیں۔ ؟

یا پھر مرنے والے کو اس لئے کندھوں پر اُٹھا لیا جاتا ہے کہ جب مرنے والا

زمین سے اُٹھ ہی گیا ہے تو پھر اُسے اور اتنا اُوپر اٹھا لو کہ وہ آسمان سے بلکہ عرش بریں سے اور زیادہ قریب ہو جائے۔؟

بات کچھ ہی ہو۔

عرش تیموری اب عرش آشیانی ہے۔

آخر بھلا عرش زمین پر رہ بھی کیسے سکتا ہے!

عرش تو زمین پر نہیں ہوتا۔!!

عرش آسمان کا ہے۔

عرش آسمان کا تھا۔

اور اب عرش پھر آسمان پر ہے۔

عرش نے مہینوں پہلے سے اس دُنیا سے جانے کی تیاریاں کر لی تھیں۔ اس نے مرنے سے آٹھ مہینے پہلے ہی آخری رختِ سفر باندھ لیا تھا۔

شام کو اُس وقت جب عرش تیموری کے جسم میں گنتی کی چند سانسیں باقی رہ گئی تھیں میں اُس وقت پاک امریکی کلچرل ایسوسی ایشن کی عمارت میں امریکہ کے مقتول صدر جان ایف کینیڈی کی زندگی اور موت کے بارے میں ایک فلم دیکھ رہا تھا۔

اس فلم میں یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ انسان کتنا طاقتور ہے۔ اس کے علم نے کتنی حیرت انگیز ترقی کر لی ہے۔ زمین تو زمین۔۔ انسان نے خلا اور سیاروں کو بھی بڑی حد تک تسخیر کر لیا ہے۔

ایک منظر میں یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ بڑے اور طاقتور انسان کینیڈی نے اپنے خلائی انسان "ایلن شیپرڈ" کو حکم دیا اور اس کا حکم ملتے ہی ایلن شیپرڈ کا خلائی راکٹ چاند پر کمند پھینکنے کے لئے روانہ ہوگیا۔

اس راکٹ کی پرواز کے بعد دوسرے منظر میں دکھایا گیا کہ

جان کینیڈی نہایت فاتحانہ انداز میں مسکراتا ہوا "وہائٹ ہاؤس" میں داخل ہو رہا ہے۔

لیکن پھر فوراً اس منظر کے بعد یہ منظر تھا کہ جان کینیڈی کا تابوت جس میں طاقتور اور بڑا انسان کینیڈی بے حس و حرکت پڑا تھا — اسی دروازے سے داخل ہو رہا تھا جس دروازے سے ابھی تھوڑی دیر پہلے جان کینیڈی نہایت خوش اور فتح مندی کے جذبے سے سربلند داخل ہوا تھا۔

یہ فلم بڑی خیال انگیز تھی اور میں یہ سوچتا ہوا گھر لوٹا تھا کہ

طاقتور انسان نے زندگی پر تو فتح پالی ہے لیکن وہ ابھی تک موت پر کیسے فتح حاصل نہیں کر سکا۔

کیا اسے موت پر بھی کبھی فتح حاصل ہوگی۔؟

میں یہی سوچ رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ایک بھرائی آواز میں یہ دردناک الفاظ گونجے۔

"عرشی کا انتقال ہوگیا۔"

موت تو بڑی بات ہے۔ انسان تو موت کے پروانے پر بھی قابو نہ پا سکا۔

"سرطان کا مرض" موت کا پروانہ یا موت کا حکم نامہ ہی تو ہے:

میڈیکل سائنس نے ترقی کی بلندیوں کو چھو لیا ہے لیکن ابھی تک دُنیا کا سب سے بڑا ڈاکٹر بھی سرطان کے مرض ہی کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکا چہ جائیکہ کہ اس کا علاج۔

چنانچہ جس دن ہم سب کو پتہ چلا کہ عرش تموری کو سرطان ہو گیا ہے تو نہ صرف ہم سب دوستوں نے عرش کی موت کے فرشتے کے قدموں کی چاپ سُن لی۔ بلکہ عرش نے خود بھی اس کی آہٹ سُن لی تھی۔ چنانچہ ایک دن وہ کہنے لگے۔

"میرے دادا ۴۳ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ میرے والد بھی ۴۳ سال میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب میری عمر بھی ۴۳ ہو چکی ہے!"

لیکن چونکہ انسان کو آخری سانس تک بھی زندگی کی آس ہوتی ہے میر خلیل الرحمٰن نے عرش صاحب کو ٹوکیو (جاپان) بھیجنے کے انتظامات مکمل کر لیے۔ کہتے ہیں کہ جاپان میں ایک ڈاکٹر ایسا ہے جو ساری دُنیا کا واحد ڈاکٹر ہے جو سرطان کا علاج کامیابی سے کرتا ہے، بڑی اُمیدیں بندھ گئیں۔ اور ہمارے ایک دوست جو "محیر العقل کرامات" پر بڑا اعتقاد رکھتے ہیں بولے:۔

"اب عرش کی موت ٹل گئی ہے اچھا ہوا کہ سب سے لمبے سفر سے پہلے پاکستان سے جاپان تک والا لمبا سفر درمیان

میں آگیا ہے یہ لمبا سفر آخری لمبے سفر" کا نوٹ ثابت ہوگا۔

لیکن ٹوکیو کے ڈاکٹر نے بھی میر خلیل الرحمان کے نام خفیہ خط میں مایوسی کا اظہار کردیا تاہم ہم دوستوں نے عرش کو بڑے امید افزا خطوط لکھنے شروع کر دیئے ایک خط میں نے انہیں لکھا کہ

" آپ کی ٹوکیو سے واپسی پر میں ایک نہایت شاندار ڈنر دے رہا ہوں اور آپ کی سیرت کا جلسہ بھی کروں گا "

عرش کا جواب آیا:۔

جب تک میں تندرست تھا تو آپ نے بھولے سے بھی کبھی ڈنر کا ذکر نہیں کیا۔ اب آپ مجھے عظیم الشان ڈنر کا لالچ دے رہے ہیں۔ شاید اس لئے بھی کہ ابھی تک کسی کو میرے زندہ واپس آنے کا یقین نہیں خیر اس مرتبہ قدرت نے آپ سب سے زبردست انتقام لیا ہے میں جلد زندہ واپس آرہا ہوں۔ اگر یہ وعدہ "وزیری" نہیں تو اب آپ کو پورا کرنا ہوگا۔ خوب پھنسے! باقی وغیرہ وغیرہ بالمشافہ۔

آپ کا عرش

یہ عرش کی قوت ارادی تھی یا پھر پیارے وطن پاکستان کی اس کے لئے کشش۔ وہ جاپان سے زندہ تو واپس آیا — لیکن شاید مادر وطن کی آغوش میں ہمیشہ کی نیند سو جانے کے لئے۔

لیکن میں نے وہ منظر نہیں دیکھا کہ وطن کی زمین نے عرش کو کس طرح اپنی آغوش میں لیا۔؟

میں تو عرش کے زمین سے رشتے کو مانتا ہی نہیں۔ اسی لئے تو میں نے عرش کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ آسمان کی طرف، عرش تو آسمان پر ہی ہوتا ہے نا۔

احمد اسحٰق

(احمد اسحٰق صرف جنت کے لئے موزوں تھا)

میں نے احمد اسحٰق مرحوم کو جناح اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرتے دیکھا ہے۔ میں نے اس کے جنازے کو کندھا دیا ہے۔ میں نے اس کی قبر کو مٹی دی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ میں نے ذہنی اور شعوری طور پر اس کی موت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ جیسے آج بھی میرے لئے زندہ ہے۔ اور میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے وہ یہیں کہیں ہے بس نظروں سے اوجھل ہے۔ جبھی تو مجھے اس کی موت کا یقین اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ کوئی مجھے یاد نہ دلائے۔

ابھی کل ہی کی بات ہے۔ صبح عزیزم عارف اسحٰق حسب معمول ہمیشہ کی طرح آئے اور انہوں نے جب یہ کہا کہ

"بھائی احمد اسحٰق کی یاد میں چوتھا بین الکلیاتی مباحثہ ۸ اپریل کو ہوگا"۔
تو مجھے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے میرے ذہن کے کسی گوشے میں سویا ہوا احمد اسحٰق ہڑبڑا کر جاگ پڑا ہے۔

سچ — جب تک کوئی مجھے یاد نہیں دلاتا کہ احمد اسحٰق کا انتقال ہو چکا ہے میں اس کی موت کو تسلیم کرنے یا اس پر یقین کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوں۔

میں بھلا کیسے تسلیم کر لوں! کیسے یقین کر لوں! کہ صرف ۲۳ سالہ ایک ایسا صحت مند جوان جس کی بھرپور جوانی پر گناہ کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہ ہو۔ جو شراب و سگریٹ کے زہر سے شدید نفرت کرتا ہو اور اپنی صحت کی حفاظت خدا کی دی ہوئی امانت کی طرح کرتا ہو وہ کس طرح مر جاتا ہے!! اور وہ لوگ کیسے زندہ رہ جاتے ہیں جن کی زندگیاں گناہوں سے لہولہان ہوتی ہیں۔ جن کی رگ و پے میں شراب و سگریٹ کے زہر کے سوائے اور کچھ نہیں ہوتا اور جو خدا کی دی ہوئی امانت "زندگی" میں نہایت ڈھٹائی کے ساتھ خیانت کرتے رہتے ہیں۔!

کوئی شخص طویل بیماری کے بعد اس دنیا سے اُٹھ جائے۔ کوئی شخص زندگی کی ساری بہاریں دیکھنے کے بعد عمر طبعی مکمل کر کے گزر جائے تو صبر آسانی سے میسر آجاتا ہے لیکن جو شخص بھرپور صحت مند ہو بہت نوجوان ہو اپنی صحت کی آبرو کی طرح حفاظت کرتا ہو وہ چٹ سے بیمار ہو اور پٹ سے وفات پا جائے تو پھر رضائے الٰہی کے سامنے جھکنے والا سر بار بار بلند بھی ہو جاتا ہے اور خداوند تعالٰے سے پوچھنے

بھی لگتا ہے کہ

"پروردگار۔ یہ کیا۔ ؟ یہ کیسے۔ ؟"

احمد اسحٰق مرحوم سے میری دوستی کی عمر ۱۴ سال ہے اب سے کوئی ۱۴ سال پہلے میں اور وہ ایک دفتر میں بلکہ میز پر بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ ہم دونوں کی طبیعتیں تو بہت ملتی جلتی تھیں، لیکن عادات میں بڑا فرق تھا۔ احمد اسحٰق اَن تھک کام کرنے والا جوان اور میں تن آسان۔ اکثر میں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر چلا جاتا۔ واپس آتا تو پتہ چلتا کہ احمد اسحٰق اپنے کام کے علاوہ میرا سارا کام بھی سمیٹ کر جا چکے ہیں۔

ہم اخبار نویسوں میں بے تحاشا سگریٹ نوشی اور چائے نوشی عام ہے بعض تو بادہ آسانی کا بھی شوق فرماتے ہیں چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ کوئی بہت بڑی دعوت تھی جس میں شراب اور سگریٹ کی فراوانی تھی۔ اور کولڈ ڈرنک کی بوتلیں بھری کی بھری دھری ہوئی تھی۔ احمد اسحٰق بھی اس دعوت میں مدعو تھے۔ میزبان کے اصرار پر انہوں نے پاکولا کی تین بوتلیں پی لی تھیں۔ اور مخمور میزبان کا اصرار تھا کہ کولڈ ڈرنک کی جتنی بوتلیں ہیں وہ صرف احمد اسحٰق پئیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ممکن نہ تھا اس پر مخمور میزبان نے ایک میٹھے طنز سے کہا :۔

"احمد۔ تم نہ سگریٹ پیتے ہو نہ چائے نہ شراب۔ نہ جھوٹ بولتے ہو نہ غیبت کرتے ہو نہ سازش کرتے ہو حتیٰ کہ اس عمر میں بھی عصمت نظر کے قائل ہو تو پھر تم اس زمین پر ہیں کیوں

بور کر رہے ہو؟ جاؤ نا۔ جنت میں جا کر بیٹھ جاؤ۔"

احمد نے حادثاً اپنا معصوم قہقہہ لگایا تو میزبان اس سے لپٹ گیا اور بولا:۔

"احمد۔ میرے مذاق کا بُرا نہ ماننا لیکن میں تمہاری دل سے عزت کرتا ہوں، عمر میں تم سے بڑا سہی۔ لیکن جب تمہیں اپنے سامنے دیکھتا ہوں تو بڑا شدید احساس کمتری محسوس کرنے لگتا ہوں۔"

بات اس وقت تو آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس کے صرف چند ہی دن بعد اچانک ایک ٹیلی فون آیا کہ احمد اسحٰق جناح اسپتال میں ہیں۔ اور انہیں خون کی ضرورت ہے میں نے اس خبر پر یقین نہ کیا لیکن دوسرے دوست جا رہے تھے تو میں بھی ساتھ ہو لیا۔ لیکن اس وقت بھی مجھے احمد کے چہرے پر موت کی ہلکی سی بھی پرچھائیں نظر نہ آئی۔ وہی شگفتہ اور شاداب چہرہ — ! ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا:۔

"ان میں بڑی زبردست قوت مدافعت ہے جلد ہی تندرست ہو جائیں گے۔"

مجھے بھی یقین آگیا۔ پھر میں اس کی زندگی میں جناح اسپتال نہیں گیا لیکن جب روزنامہ جنگ کے رپورٹر حامد سعیدی نے سسکتی ہوئی آواز میں ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ

احمد اسحٰق . . . .

حامد سعیدی اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا اور کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

صرف احمد اسحٰق ہی نہیں بلکہ اس کا نام بھی آنسوؤں میں ڈوب چکا تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ واقعی اُس دعوت کے میزبان نے عجب بات کہی تھی کہ

"جاؤ نا اپنی جنت میں"

احمد نے بھی سوچا ہو گا کہ واقعی جب شراب نہیں پی سکتا۔ سگریٹ نہیں پی سکتا۔ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ دھوکہ نہیں دے سکتا۔ سازش نہیں کر سکتا۔ گناہ نہیں کر سکتا تو پھر میں اس دُنیا میں کیوں موجود ہوں!؟

واقعی احمد اسحٰق اس دُنیا کے لئے ناموزوں تھا۔

احمد اسحٰق "خبروں کا ایڈیٹر" تھا۔

اب احمد اسحٰق خود "ایک خبر" ہے۔

اب احمد اسحٰق صرف "ایک خبر" ہی نہیں۔

بلکہ "ایک قبر" بھی ہے۔

میرا ہم پیشہ، ہم محلہ، ہم پیالہ ہم نوالہ بہت ہی پیارا دوست احمد اسحٰق جب کبھی قومی سیاست کے بارے میں خبروں کی تلاش میں نکلتا تھا تو ہم سب اس کی واپسی کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے تھے کیونکہ وہ جب بھی لاتا بہت اہم بہت بم اور بڑی چونکا دینے والی خبریں لاتا تھا۔

خبروں کا دیوانہ احمد اسحٰق پچھلے جمعے کی تمام خبروں کی تلاش میں اچانک آسمانوں

کی طرف نکل گیا۔ کراچی کے سارے اخبار نویس جناح ہسپتال کے آپریشن تھیٹر کے باہر بڑی بے چینی سے انتظار کرتے رہے کہ اب احمد آسمانوں سے بھی کوئی بہت بڑی کوئی بہت چونکا دینے والی خبر لے کر آئے گا۔

لیکن احمد کے بجائے آپریشن تھیٹر سے ایک ڈاکٹر باہر نکلا اور اس نے کراچی کے اخبار نویسوں کو احمد کا یہ پیغام سنایا کہ

"دوستو! آج پہلی بار میں کوئی بہت بڑی خبر لانے میں ناکام ہو گیا ہوں اس لئے میں اب تمہیں کبھی اپنی شکست خوردہ شکل نہیں دکھاؤں گا۔ بہتر یہی ہے کہ آج تم مجھے ہی خبر بنا کر چھاپ دو"

کراچی کے اخبار نویسوں نے اپنے پیارے خوددار ساتھی کے حکم کے احترام میں نہ صرف اُسے خبر بنا کر چھاپ دیا ہے، بلکہ قبر بنا کر چھپا بھی دیا ہے۔

دُنیا واقعی سرائے ہے۔ اس میں کوئی انسان بھی ہمیشہ کے لئے نہیں رہ سکتا۔ بڑے بڑے طاقتور بادشاہ شہنشاہ، چاند ستاروں پر کمندیں پھینکنے والے سائنس دان، بڑے بڑے ڈاکٹر، حکیم اور مسیحا حتیٰ کہ خداوند تعالےٰ کے مقربین خاص پیغمبران کرام تک اس دُنیا میں اپنے وقت مقررہ سے زیادہ نہ رہ سکے تو احمد اسحٰق تو ایک عام معمولی غریب اخبار نویس تھا۔

سب کو اس دُنیا سے جانا ہے۔ احمد اسحٰق بھی چلا گیا لیکن احمد اسحٰق کے چلے جانے کا بہت غم اس لئے ہے کہ ابھی اس کی زندگی کی شام نہیں ہوئی تھی، اور وہ جوانی کی کڑی دوپہر ہی میں صرف ۳۳ برس کی عمر میں بھری بزم سے اُٹھ کر ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔

ابھی تین سال پہلے تو وہ دولہا بنا تھا۔ ابھی تین سال پہلے تو اس کی دُلھن اس کی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی اور اس کی زندگی کے گلستان میں ابھی توصرف تین ہی کلیاں چٹکی تھیں، ابھی یہ ننھی ننھی کلیاں پھول بھی تو نہیں بنی تھیں ! -

لیکن — لیکن سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ خداوند تعالےٰ نے جس انسان کے لئے دُنیا میں جتنے دن لکھ دیئے ہیں اس سے ایک لمحہ بھی زیادہ انسان اس دُنیا میں ٹھیر نہیں سکتا۔

احمد اسحٰق بھی یہ اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ موت سے ایک دن پہلے جب اس نے موت کے قدموں کی چاپ سُن لی تو اپنے پیارے دوست حاجی عبدالغفار سے بولا۔

"حاجی صاحب۔ میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن موت کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا اس تصوّر سے ضرور ڈرتا ہوں"

بہ حیثیت مسلمان کوئی مسلمان بھی موت سے نہیں ڈرتا ہے لیکن سوائے ان خوش نصیب مسلمانوں کے جنہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی بیوی بچوں اور دیگر پسماندگان کے لئے خوش حال زندگی کے اسباب مہیّا کر دیتے ہیں، احمد اسحٰق کی طرح ہر وہ مسلمان اور خاص طور پر پاکستان کا ہر غریب صحافی جس کی زندگی کی چادر اتنی لمبی نہیں ہوتی کہ وہ یا اس کے پیارے پوری طرح پیر پھیلا کر سو سکیں —— اپنے متعلقین کی اُس زندگی سے ضرور ڈرتا ہے جو اُس کی موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔

احمد اسحٰق بھی ایسا ہی محنت کش اور غریب صحافی تھا جس کے کوٹ کی ایک

جیب بھی اس کی تنخواہ کے دن بھی کبھی پوری نہ بھرتی تھی۔

احمد اسحٰق میرے ہی ساتھ اخبار پیام میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی نوکری سے چلا۔ اخبار جنگ میں وہ چار سو روپیہ ماہوار تک پہنچا۔ اور ابھی چند مہینے پہلے حریت اخبار میں وہ چھ سو روپے ماہوار کا "نیوز ایڈیٹر" بنا تھا! ور ابھی ابھی اس کی زندگی میں خوشحالی کا دروازہ کُھلا تھا کہ احمد اسحٰق اپنی بیوی کو سُہاگ کا آنچل اوڑھانے کے بجائے بیوگی کا سفید دوپٹہ اوڑھا کر چلا گیا۔

"تمہیں یہ اچھی ترقی ہوئی تھی احمد اسحٰق؟"

احمد اسحٰق پاکستان کا کوئی بہت بڑا آدمی نہیں تھا۔ کوئی مشہور و معروف شخصیت نہیں تھا کہ ساری قوم کو اس کی موت کے غم اور ماتم میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے۔

لیکن میں چاہتا ہوں کہ ساری قوم احمد اسحٰق کی جوانمرگی کا ماتم کرے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ احمد اسحٰق . . . . .

مرا نہیں بلکہ اس کا خون کیا گیا ہے۔

احمد اسحٰق جس نے منشیات تو کجا زندگی میں کبھی سگریٹ تک کو منہ نہیں لگایا۔ جو ہر طرح صحت مند تھا۔

اچانک اس کے معدے میں پھوڑا کیسے نکل سکتا ہے؟

یہ سوال ساری قوم اور حکومت کے بھی سوچنے کا ہے۔ احمد اسحٰق کے دو آپریشن

ہوئے۔ اس کے جسم کی رگ رگ کا تجزیہ کیا گیا۔ لیکن کیا اُن غذاؤں کا بھی تجزیہ کیا جاتا ہے جن میں طرح طرح کی ملاوٹ ایک بالکل صحت مند ۳۳ سالہ کڑیل جوان کے معدے اور آنتوں کو چھلنی کر دیتی ہے۔؟

احمد اسحٰق خون تھوکتا رہا۔ احمد اسحٰق کو خون دیا جاتا رہا۔

لیکن کیا یہ سچ ہے کہ احمد اسحٰق مرا نہیں بلکہ اس کا خون کیا گیا۔؟

اس سوال کا جواب احمد اسحٰق کی جواں سال بیوہ کے سر پر سہاگ کا دوپٹہ تو نہیں اوڑھا سکتا۔

اس سوال کا جواب اس کے بچّوں کے سر پر باپ کی شفقت کا ہاتھ تو نہیں پھیر سکتا۔

لیکن شاید اس سوال کا صحیح جواب دوسری بہت سی جواں سال سُہاگنوں کو بیوگی کے دوپٹے اور دوسرے بہت سے بچّوں کو یتیمی کی دھوپ سے دور اور محفوظ رکھ سکے۔

اب وقت آگیا ہے کہ اس سوال کا صحیح جواب منظرِ عام پر آجانا چاہیئے۔

اب احمد اسحٰق زندہ تو نہیں ہو سکتا۔

لیکن احمد اسحٰق کو دوبارہ مرنا بھی نہیں چاہیئے۔

احمد اسحٰق کے انتقال کی خبر بھی سُن لی۔

اس کی قبر بھی دیکھ لی۔

لیکن "تابِ صبر" کہاں ہے۔؟

کوئی نہیں بتاتا۔ کوئی نہیں بتاتا۔

میاں افتخار الدین

مجھے میاں افتخار الدین سے نہ تو زیادہ قریب رہنے کا شرف حاصل رہا ہے اور نہ کبھی میں ان کا سیاسی یا روایتی رقیب ہونے کی جرأت کر سکا ہوں۔ البتہ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں ایک بڑے طویل سفر میں ان کا ہم سفر رہا ہوں پاکستان سے دور دُنیا میں آزاد انسانوں کے سب سے بڑے ملک عوامی جمہوریہ چین، میں تین ہفتے سائے کی طرح ان کے ساتھ رہا ہوں، یا ان کے سایۂ عاطفت میں نئی زندگی سے روشناس ہوا۔

۱۹۵۱ء میں جب کہ عوامی جمہوریہ چین نے پہلی بار اپنے یوم استقلال یکم اکتوبر کی تقریب کے لئے دُنیا کے بہت سے دوست ممالک کے دوستوں کو چین آنے کی دعوت دی تھی، ان دوستوں میں میرے اور میاں افتخار الدین کے علاوہ بابائے اردو مولوی عبد الحق اور بیگم

جہاں آرا شاہ نواز بھی مدعو تھے، لیکن بابا تے اردو انہیں علالت اور بیگم شاہ نواز اپنی دختر نیک اختر بیگم نسیم اکبر خان کے مقدمہ راولپنڈی (سازش) کی وجہ سے چین نہ جا سکے، صرف میں اور میاں افتخار الدین رہ گئے۔ میاں صاحب ان دنوں یورپ کے دورے پر تھے۔ سوائے عالم بالا کے کسی جگہ بھی وقت پر نہ پہنچنا میاں افتخار الدین کی انفرادیت کا خاصہ تھا۔ چنانچہ میں نے ان کے انتظار کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ اور یک و تنہا کراچی سے چین روانہ ہو گیا۔'

چینی میزبانوں کو یہ اطلاع تھی کہ دو رکنی وفد پاکستان سے چین پہنچ رہا ہے قائد وفد (یا آسان عام فہم زبان میں) لیڈر آف دی ڈیلی گیشن میاں افتخار الدین تھے اور ڈیلی گیشن صرف یہ حقیر، فقیر بے تقصیر۔ یک و تنہا۔

سارے انسانوں میں میزبانی میں درجہ اول چینی میزبان استقبال کو کھڑے تھے۔ انہوں نے جب مجھے یک و تنہا دیکھا تو پاکستان کا پہلا عوامی سفیر کا جو خطاب انہوں نے میاں افتخار الدین کے لئے تجویز اور مخصوص کر رکھا تھا۔ اس خطاب سے مجھے نواز دیا۔

اس سے پہلے پاکستان کے سرکاری سفارتی عہدیدار اور نمائندے چین میں موجود تھے۔ لیکن میں پہلا غیر سرکاری یا عوامی نمائندہ تھا جس کے لئے ۷۰ کروڑ محبت بھرے دل رکھنے والے چین نے اپنے پیار کی باہیں پھیلا دی تھیں۔

چھ دن تک تو میں بلا شرکت غیرے پاکستان کے پہلے عوامی سفیر کے خطاب اور اعزاز سے نوازا جاتا رہا ہے۔ لیکن پانچویں دن علی الصبح ہمارے معزز میزبان کامریڈ کو موجو

نائب وزیراعظم کا ٹیلی فون مجھے موصول ہوا کہ میاں افتخار الدین گیارہ بجے پیکنگ پہنچ رہے ہیں کیا تم میاں صاحب کے استقبال کے لئے پیکنگ کے ہوائی اڈے ہمارے ساتھ چلو گے

میں نے جواباً کہا

"لیڈر آرہا ہے تو ڈپلومیٹ اس کے استقبال کے لئے کیسے نہ جائے۔

"میں ضرور چلوں گا۔"

میں کامریڈ کو موجو کے ساتھ پیکنگ کے ہوائی اڈے پہنچا۔ چینی طیارے وقت کی پابندی میں حضرت عزرائیل علیہ السلام کے پیرو معلوم ہوتے ہیں لیکن چونکہ اس چینی طیارے سے میاں صاحب سفر کر رہے تھے اس لئے یہ طیارہ بھی کوئی ۴۵ منٹ لیٹ پہنچا۔

اب جب کبھی کوئی شخص انگریزی زبان میں میاں صاحب کو یاد کرتا ہے۔

آہ۔ لیٹ میاں افتخار الدین تو مجھے "لیٹ" کا "مرحوم" کے علاوہ دوسرا مفہوم بھی فوراً یاد آتا ہے۔ یعنی دیر سے آنا۔

کاش۔ آل ویز لیٹ دی لیٹ میاں افتخار الدین دُنیا سے اپنے آخری سفر میں بھی لیٹ ہو جاتے۔!

جس وقت پاکستانی عوام کو ان کی زیادہ ضرورت نہیں تھی، اس وقت تو وہ بار بار لیٹ ہوتے رہے لیکن جس وقت پاکستانی عوام کو ان کی رہبری اور سایۂ عاطفت کی شدید ضرورت تھی۔ انہوں نے سفر میں پابندیٔ وقت کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔

پیکنگ میں میاں افتخار الدین کے بعض پُرانے ہندوستانی دوست ملے، پنڈت نہرو

کی بہن کرشنا ان کے شوہر راجہ ہتھی سنگھ، پنڈت سندر لال، کرانجیا ایڈیٹر بلٹز، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر ملک راج انند وغیرہ۔ ایک دن ان کے بے تکلف دوست راجہ ہتھی سنگھ نے اُن کے بارے میں یہ پیشن گوئی کی کہ

"میاں تم اپنے یوم وفات کے کوئی بارہ سال بعد صحیح معنٰی میں مرو گے!"

راجہ ہتھی سنگھ کو کچھ علم نجوم وغیرہ میں بھی درک تھی، ان کا یہ معمہ جواب کسی کے سمجھ میں نہ آیا۔ تو راجہ ہتھی سنگھ نے کہا۔

تمہارا اصلی یوم وفات تو چپ چاپ دبے پاؤں اس دُنیا سے گزر جائے گا لیکن تمہاری وفات کے کوئی بارہ سال بعد عوام ایک دم تمہیں یاد کریں گے اور ماضی کے فراموش خانے سے تمہارے یوم وفات کو جھاڑ پونچھ کر نکالیں گے اور اسے دُنیا والوں کے سامنے دھوم دھام سے پیش کریں گے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ آئندہ پچاس سال بعد تمہاری قبر کو مزار کا درجہ ملے اور ہر سال تمہارا عرس بھی منایا جائے۔!

راجہ ہتھی سنگھ نے تو یہ بات اپنے فرض علم نجوم یا محض مذاق میں کی ہو گی لیکن وہ مذاق اب ایک حقیقت ثابت ہوا۔

میاں افتخار الدین کی موت بھی حسن ناصر کی شہادت کی طرح پہلے پہل چپ چاپ دبے پاؤں اس دُنیا سے گزر گئی۔ مگر پاکستانی عوام کبھی بھی محسن کش نہ رہے۔ وہ مجبوریوں کے باعث علی الاعلان تو اپنے محسنوں کا ماتم نہ کر سکے لیکن جب بھی ان کے سامنے سے مجبوریوں کے پردے ہٹے تو انہوں نے دیکھا کہ یہ محسن شناس عوام دل ہی دل میں اپنے محسنوں کیلئے

کتنے سوگوار رہے ہیں۔

میاں افتخار الدین ۱۹۶۲ء میں پاکستان کے حکمرانوں سے روٹھ کر ہمیشہ کیلئے پاکستان بلکہ دُنیا سے چلے گئے ...... اور اب کوئی نو سال بعد پہلی بار صحیح معنی میں ان کا یوم منایا جا رہا ہے۔

بس آج کے بعد سے پاکستان کی تقویم میں چھ جون کا دن صرف میاں افتخار الدین کا دن رہے گا۔

جابر سُلطان کے آگے کلمہ حق بولنے کا جہاد کرنے والے میں نے کسی مجاہد کو بھی نہیں دیکھا ہے۔ میں نے سُقراط کو زہر کا پیالہ پیتے نہیں دیکھا۔ میں نے پھانسی کے پھندے کے سامنے منصور کا نعرہ انا الحق نہیں سُنا۔ البتہ میں نے میاں افتخار الدین کو ضرور دیکھا ہے میاں افتخار الدین کو دیکھنے کے بعد پھر نہ سقراط کو زہر کا پیالہ پیتے دیکھنے کی ضرورت ہے اور نہ تختہ دار پر منصور کا نعرۂ انا الحق کی ضرورت ہے۔

اس ملک میں حاکم کے منہ پر بیباک سچ بولنے کی جرأت صرف دو انسانوں میں تھی؛
میاں افتخار الدین —!
مادرِ ملّت محترمہ فاطمہ جناح —!

جس دن میاں افتخار الدین کا انتقال ہوا ان کے لئے تعزیتی جلسے کی صدارت کے لئے راقم الحروف چند دوستوں کے ساتھ مادرِ ملّت محترمہ فاطمہ جناح کی خدمت میں حاضر ہوا تھا محترمہ فاطمہ جناح بہت اُداس تھیں، وہ چند وجوہات کے باعث اس جلسے

کی صدارت نہ کر سکیں۔ انہوں نے کوئی پیغام بھی نہ دیا۔ البتہ جب ہم ان سے رخصت ہونے لگے۔ تو وہ میاں افتخار الدین کا ذکر بڑے درد بھرے لہجے میں کیا اور آخر میں یہ کہا "کیا اس ملک میں سٹیج پر لڑنے والے اسی طرح جلدی جلدی اُٹھتے چلے جائیں گے۔"!

——————— میاں افتخار الدین بھی دُنیا کے ان چند انسانوں میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پیدا تو کرتا ہے لیکن موت سے مستثنیٰ کر دیتا ہے کہتے ہیں جب تک انسان یاد آتا رہے گا۔ وہ زندہ ہے۔ میاں افتخار الدین کی یاد کو بھی صور اسرافیل مٹا سکے تو مٹا دے صور اسرافیل سے قبل میاں افتخار الدین کا نام اور ان کی یاد لوح ذہن سے مٹانا ممکن ہے۔

دُنیا کا آخری دن آئے تب ہی میاں افتخار الدین کا آخری دن بھی آئے گا۔

ڈاکٹر شوکت ہارون

دُنیا میں بعض انسان ایسے آتے ہیں جن کا سامنا کرتے ہوئے موت بھی گھبراتی ہے جبھی تو موت کبھی سامنے سے ان پر حملہ آور نہیں ہوتی۔ پیچھے سے چپکے سے اچانک ان پر ٹوٹ پڑتی ہے اور وہ بے خبری کے عالم میں دھڑام سے ہمیشہ کے لئے گر پڑتے ہیں۔

موت ایسا کیوں کرتی ہے۔؟

کیا موت کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر وہ سامنے سے حملہ کرے تو یہ اس کا مقابلہ کر کے کہیں اسے پسپا نہ کردیں۔؟؟

پھر کیوں موت اس طرح بلا اطلاع اچانک حملہ آور ہوتی ہے۔؟؟؟

موت نے ڈاکٹر شوکت ہارون کو بھی تو اسی طرح ہمیشہ کے لئے ڈھیر کردیا ہے۔

ڈاکٹر شوکت ہارون کو پتہ ہی نہیں تھا کہ موت اس طرح انہی کے گھر میں چھپی بیٹھی ہے اور سرِ شام اس طرح اچانک ان پر حملہ کر دے گی۔

صبح وہ لندن کے سفر سے لوٹی تھیں۔

شام وہ آسمان کے سفر پر روانہ ہو گئیں۔

ان کے بہت سے مریض گذشتہ دو مہینوں سے ان سے اپنی زندگی کے قرض چکانے کے انتظار میں بیٹھے تھے لیکن وہ کراچی آئیں اور اچانک خود ہی موت سے فٹافٹ اپنا سودا کر لیا۔!؟

کیا وہ صرف اپنی موت سے ملنے کے لئے کراچی لوٹی تھیں۔!؟

اپنے وطن سے کون بدنصیب محبت نہیں کرتا لیکن بعض خوش نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وطن کی مٹی خود ان سے پیار کرتی ہے۔

پاکستان کی مٹی بھی یقیناً شوکت ہارون سے بے تحاشہ پیار کرتی تھی، جبھی تو جیسے ہی وہ لندن سے کراچی آئیں پاکستان کی مٹی نے انہیں ایسی گرم جوشی سے اپنی آغوش میں چھپا لیا کہ اب وہ اس آغوش کے چنگل سے کبھی نکل ہی نہیں سکتیں۔

ورنہ وہ لندن میں بھی مر سکتی تھیں۔!

ورنہ اپنے وطن پاکستان کے پہنچتے ہی ان کا مر جانا کیا معنے رکھتا ہے۔!؟

تین سال پہلے کی بات ہے۔ کسٹمز کراچی کی طرف سے ان کے کلب واقع کیماڑی میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں جانے کے لئے میں نے اپنے محترم دوست

محمد حسین عطا صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے اپنی گاڑی میں لے چلیں۔ محمد حسین عطا آئے ان کے ساتھ ڈاکٹر شوکت ہارون بھی تھیں میرا ان سے پہلا تعارف ہوا پہلے ہی تعارف میں وہ بے تکلف ہوگئیں اور بولیں۔

"تم اچھا لکھتے ہو یا خراب یہ تو میں نہیں جانتی لیکن یہ ضرور جانتی ہوں کہ زندگی میں ہنسی بہت کم ہے اور تم اپنا فرض بخوبی انجام دے رہے ہو"

اس مشاعرے میں میں نے فیض احمد فیض صاحب کے ساتھ ایک "دوستانہ گستاخی" کی تھی۔ فیض صاحب کی علم واطلاع کے بغیر ان کے سامنے اسی مشاعرہ میں فیض صاحب کی نظموں کا پنجابی زبان میں ترجمہ سنایا تھا یعنی

ے رنگ پیراہن دا خوشبو دال بکھیرا تے داناں
موسم گل ہے تہاڈے بام تے آنے داناں

شوکت ہارون ہنستے ہنستے بے حال ہوگئیں اور کہنے لگیں۔
ہنستے ہنستے کہیں میرا ہارٹ فیل نہ ہو جائے"
میں نے کہا

"ڈاکٹر۔ آپ جیسی زندہ دل ہستی کا ہارٹ فیل کبھی فیل نہیں ہو سکتا"
لیکن اب جیسے ان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے کہ
ع دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا۔

قائداعظم کی گودی میں کھیلی اور عبداللہ اور لیڈی ہارون کے پیار میں پلی یہ امیر خاتون بڑی غریب ہستی تھی۔ غریبوں محتاجوں اور بیماروں کی بے لوث اور چپ چاپ خدمت اس کی زندگی کا مشن تھا۔

میری بیوی جب ان کے زیر علاج تھی تو مجھے ڈاکٹر شوکت ہارون کے چھپے ہوئے خدمت خلق کے جذبہ کو بڑے قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اپنی تعریف اور تشہیر سے بہت چڑتی تھیں،

"یہ تم کیا میرا نام اخبار میں لکھتے ہو۔!"

اور پھر وہ اپنے دونوں چہیتے مددگار ساتھی ڈاکٹروں کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہتی تھیں :-

"تعریف لکھنی ہی ہے تو فریدہ (ڈاکٹر فریدون سیٹھنا) اور ڈاکٹر فرخندہ کی تعریف کرو۔ وہ دراصل تعریف کے مستحق ہیں۔"

وہ اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو، اپنے مریضوں کو بلکہ سارے لیڈی ڈفرن اسپتال کو اپنی اولاد سمجھتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں۔

"مجھے روپیوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے پاس ضرورت سے کہیں زیادہ روپیہ ہے۔ میں نے تو صرف انسانی خدمت کیلئے ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کیا ہے؟"

میں نے دیکھا ہے کہ وہ بہت سے غریب مریضوں کے لئے خون اور دیگر ضروری

ادویات وغیرہ اپنے پلّے سے خریدا کرتی تھیں، کلرکوں، چپراسیوں، مزدوروں اور ناداروں کی بیویوں کا علاج مفت کرتی تھیں۔

البتہ مالداروں سے خوب پیسے لیتی تھیں اور ان پیسوں کو وہ اسپتال کی توسیع و ترقی اور نادار مریضوں پر خرچ کر دیتی تھیں۔

میری بیمار اہلیہ کو ڈاکٹر شوکت ہارون کی لندن سے واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔

ان کے آنے کی خبر ملی تو اس نے انہیں ٹیلیفون کیا تو کہنے لگیں۔

"اچھا۔ تم پیر کی صبح اسپتال آجانا۔"

وہ پیر کا دن تھا

ڈاکٹر شوکت ہارون اسپتال نہیں آئی تھیں۔ ان کی کرسی خالی تھی اور میز پر ان کا اسٹیتھسکوپ رکھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر شوکت ہارون اسپتال کبھی نہیں آئیں گی۔

طاہرہ کشفی

اُس دن کراچی کے بے شمار لوگ میرے بہت ہی پیارے دوست ۔ میرے بھائی پروفیسر ابوالخیر کشفی کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

ان لوگوں کے ہاتھوں میں آنسو پونچھنے والے رومال تھے۔ ان کے پاس غم کو کم کرنے والے الفاظ کے مرہم تھے۔ ان کی آنکھوں میں وہ آنسو تھے۔ جو اندھیری رات کے ستاروں کی طرح خود تو روشن ہوتے ہیں، مگر رات کے اندھیرے کو دُور نہیں کر سکتے۔

اسی لئے میں ابوالخیر کشفی کے گھر نہیں گیا۔

میری آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ لیکن کشفی کی زندگی میں اچانک جو بھیانک اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اس اندھیرے کو میرے آنسو، دنیا کے تمام انسانوں کے آنسو حتیٰ کہ خود

ابوالخیر کشفی کے آنسو بھی دور نہیں کر سکتے تھے۔

کشفی کی زندگی کے آسمان پر طاہرہ کے چہرے کا جو ماہ تاباں اپنی آغوش میں دو ننھے جھلملاتے ستاروں کو لئے درخشاں تھا۔ موت کے بھیانک کالے بادل نے اسے ہمیشہ کے لئے نگل لیا تھا۔

اب صرف ایک ستارہ جگمگا رہا ہے اور کشفی کے سیاہ خانۂ حیات میں اگر کچھ روشنی ہے تو صرف اسی ننھے ستارے کی جھل مل ہے۔ ورنہ اس کے چاروں طرف گھُپ اندھیرا۔ گھور اندھیرا۔

اب کتنے ہی آنسوؤں کے چراغ جلاؤ عزیز!

آسمان پر چاند نہ ہو اور ستارے کتنے ہی بے شمار ہوں۔ زمین اندھیرے کے جنگل سے نہیں نکل سکتی۔

آج ابوالخیر کشفی کی زندگی میں بھی بے شمار آنسو فروزاں ہیں لیکن طاہرؔہ کے چہرے کا چاند نہیں ہے۔

اور جب آسمان پر چاند نہ ہو دوستو.....؟

بولو دوستو۔ ؟

جواب دو دوستو۔ ؟؟

اسی لئے میں کشفی کے گھر نہیں جاؤں گا۔

میں ایسے آنسو کبھی نہیں پونچھ سکتا جو کبھی رکتے ہی نہیں۔ یا جو پونچھنے سے ایک

دم اُبل پڑتے ہیں۔

جب تک آنسو نہ پونچھو۔ آنسو قطرہ قطرہ بہتے ہیں لیکن جیسے ہی ایک آنسو پونچھ دو تو پھر جیسے آنسوؤں کا بند ٹوٹ جاتا ہے۔ آنسو اچانک پہاڑی کی طرح بہ نکلتے ہیں اور ندی میں جیسے سیلاب آجاتا ہے۔

اب میں اپنے ہی آنسو نہیں پونچھ سکتا تو کشفی کے آنسو کیسے پونچھ سکتا ہوں ؟

اب میں کشفی کے پاس جانا بھی چاہوں تو نہیں جا سکتا۔ اب میرے اور اس کے درمیان بیچ میں کنٹری کلب روڈ پر اس کی محبتوں کا لہو پھیلا ہوا ہے۔

اس لہو سے کل تک کشفی کے گھر میں تین چراغ فروزاں تھے۔

یہی لہو کشفی کی زندگی کے گلستان کو سینچ رہا تھا۔

آج یہی لہو راہگیروں کے قدموں اور گاڑیوں کے ٹائروں تلے روندا جا رہا ہے۔

لیکن میں اس لہو کو کیسے روند سکتا ہوں، اس کو کیسے پھلانگ سکتا ہوں ؟ اس پر گذر کر کیسے جا سکتا ہوں۔؟

بھابی اور بھتیجوں کا لہو تو میرے لئے آبِ زم زم کی طرح مقدس ہے۔

میں اسے روند نہیں سکتا۔ میں اسے پھلانگ نہیں سکتا۔

اسی لئے کشفی۔ میں تمہارے آنسو پونچھنے نہیں آؤں گا۔

آج کشفی کے گھر میں جو بھیانک اندھیرا پھیلا ہوا ہے، وہ نہ میرے لئے نیا ہے۔ نہ کراچی والوں کے لئے نیا ہے۔

یہی اندھیرا کل کسی اور گھر میں تھا۔
آج کشفی کے گھر میں ہے۔
کل کسی اور گھر میں ہو گا۔

اور جب تک کراچی کی سڑکوں پر نہ خدا سے ڈرنے والے اور نہ قانون سے ڈرنے والے، ڈرائیور گاڑیاں دندناتے پھریں گے اس وقت تک زندگی کی زلفوں میں سہاگ کی مانگ اسی طرح بار بار اُجڑتی رہے گی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت نے کراچی کی ساری بسوں ٹرکوں اور رکشاؤں کو خرید لیا ہے۔ اور یہ گاڑیاں روزانہ گھر گھر اندھیرے بیچتے پھر رہی ہیں۔

چشمِ نظارہ حیران ہے کہ شہر کے چپے چپے پر قانون بھی "سفید وردی" میں ملبوس کھڑا ہے۔

اور موت کا "بلیک مارکٹ" بھی گرم ہے۔

موت کی گاڑیاں۔ ٹرک، بسیں، رکشہ، موٹریں۔ گھر گھر موت کے اندھیرے بیچتی پھر رہی ہیں۔

موت کی گاڑیاں "ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے کھیل"۔ ایک پسنجر کے چند پیسوں کے ٹکٹ اور ایک بس کے مالک کی تجوری بھرنے کی خاطر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے اپنے نیچے انسانوں کی لاکھوں کروڑوں روپے سے زیادہ قیمتی زندگیاں کیڑوں مکوڑوں کی طرح روندتی چلی جا رہی ہیں۔

ان تیز رفتار گاڑیوں کے جھونکے سے راستے کے دونوں طرف زندگیوں کے چراغ پہ چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں، ماؤں کی بھری گودیاں خالی ہو رہی ہیں، بچوں کے سروں سے عاطفت کے سائے پھٹتے جا رہے ہیں۔ شوہروں کے آغوش اُجڑ رہے ہیں اور سہاگنوں کی زلفیں بکھرتی جا رہی ہیں۔

مگر صرف لاش اُٹھانے کا انتظام ہے۔

مگر ایسا کوئی انتظام نہیں ہے کہ آج جہاں ایک لاش گری ہے۔ کل وہاں دوسری لاش نہ گر سکے۔

اس جگہ جہاں آج ابوالخیر کشفی خالی آغوش کھڑا ہے۔ آج سے چند ماہ پہلے اسی جگہ کراچی کی ایک ماں کی آغوش بھی اجڑ چکی ہے۔

اس سے پہلے اسی جگہ اور کراچی میں جگہ جگہ ہر روز کتنی پرانی لاشیں ہٹ جاتی ہیں اور ان کی جگہ کتنی نئی لاشیں آجاتی ہیں۔!

جب تک کراچی کی سڑکوں پر موت کی گاڑیاں اسی طرح بلا روک ٹوک دندناتی دوڑتی پھرتی رہیں گی اس وقت تک کون یہ کہہ سکتا ہے کہ

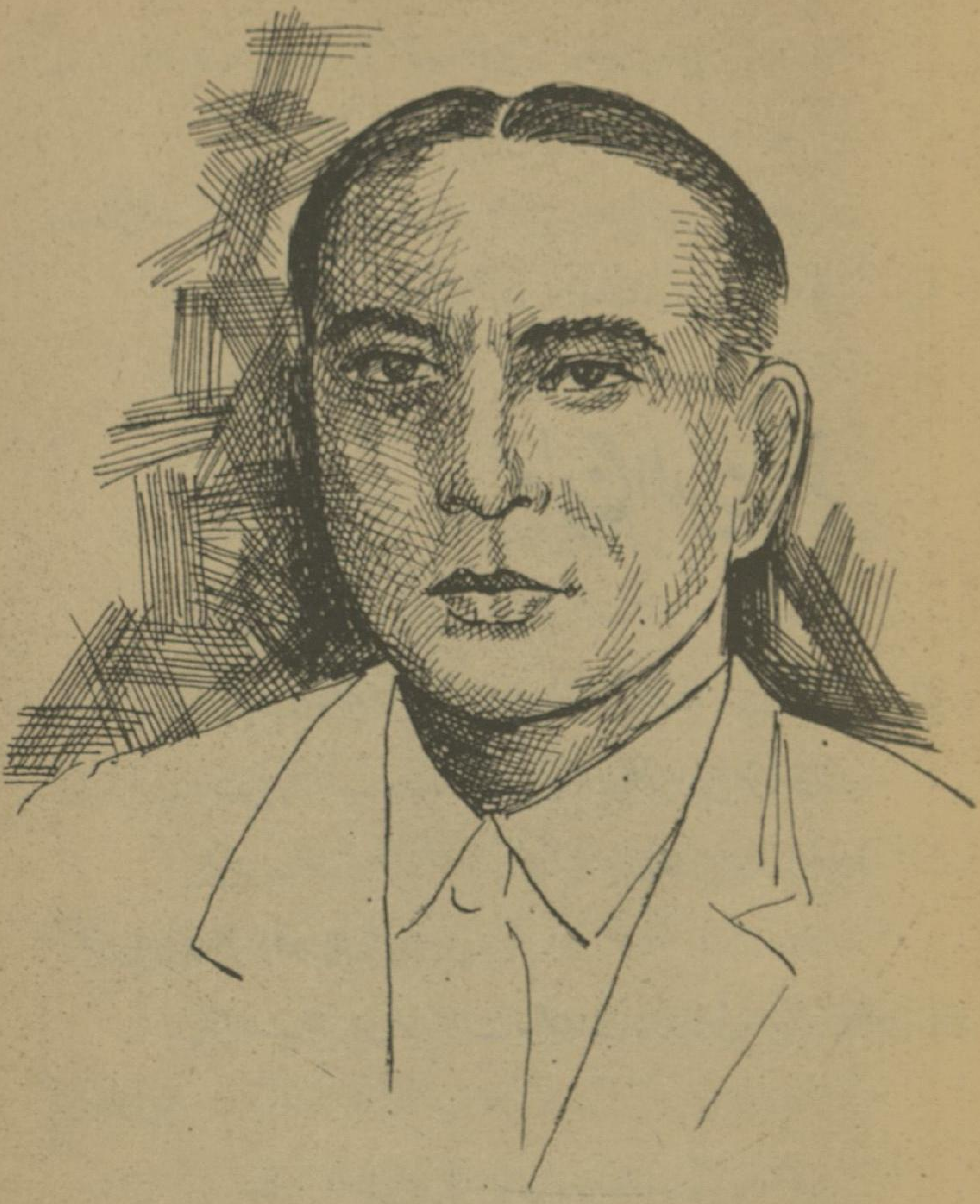
کس گھر میں کب تک کوئی چراغ جلتا رہے گا۔؟

ایک لاش کی جگہ فوراً دوسری لاش دوسری لاش کی جگہ

تیسری لاش روزانہ کتنی لاشیں۔؟؟

ہر روز لاشیں اُٹھاتے اُٹھاتے کندھے دُکھنے لگے ہیں۔

لاش تو ہمارے کندھے پر ہے۔
مگر اس کی موت کی ذمہ داری کس کے کندھے پر ہے۔؟؟
بتاؤ یارو۔ کس سے پوچھیں۔ ؟؟؟



سراج الدین ظفر

ہر شام جب سورج کراچی کی شاہراہ بندر روڈ پر کتابوں کی سب سے بڑی دکان فیروز سنز کی اوٹ میں غروب ہو جاتا تھا تو سراج الدین ظفر طلوع ہوتا تھا۔

کسی میکدے کا کوئی مہکتا گوشہ، اردگرد یارانِ قدح خوار، ساغر و مینا آ گے۔

آنکھوں میں بھی دم۔ ہاتھوں میں بھی جنبش۔

دن کو صحبتِ فقیہانِ حرم، رات کو جھرمٹ لالہ رخاں، دن کو درویشی، رات کو سلطانی۔

؎ رات بھر یار پری چہرہ و جام
صبح کو نالۂ یا ہو، یا ھو

برسوں سے سراج الدین ظفر کے یہی شب و روز تھے لیکن مرنے سے چند دن پہلے سے وہ اس روزمرہ کی یکسانیت سے جیسے اکتا سے گئے تھے۔

ان کے سفرِ آخر سے چند دن پہلے میں ان سے ملنے گیا تو وہ بڑے جھلّاتے ہوئے سے بیٹھے تھے، میری ان سے خاصی بے تکلفی تھی۔ میں نے پوچھا:۔

"یا مُرشدِ غلط کاران۔ اپنی طویل دوستی میں پہلی بار تمھیں یوں بدمزاج دیکھ رہا ہوں"

سگریٹ کا لمبا کش لے کر بولے:۔

"تھک گیا ہوں۔ تنگ آگیا ہوں۔ فیروز سنز سے سروسنز کلب، اور سروسنز کلب سے پھر فیروز سنز جو میرا گھر بھی ہے۔ نہ شب میں مہک نہ مے میں مزا۔ اب تو فیصلہ کر لیا ہے، مے کدہ، مے، یار، خوباں سب ہی بدل دوں گا"

ظفر بات کے پکے تھے۔ جو کہتے تھے کر دکھاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مے میکدہ، دوست، خوباں سب ہی بدل دیئے۔

وہ شام ہفتہ چھ مئی ۱۹۷۲ء کی بڑی اُداس شام تھی، ہفتے کی شام اور اُداس؟ ظفر حسبِ معمول فیروز سنز کی عمارت سے باہر نکلے۔ مگر طلوع ہو کر نہیں، غروب ہو کر نکلے۔

سروسنز کلب کے مہکتے میکدے کے بجائے بہشتِ بریں کا میکدہ۔

انہوں نے ہمیشہ کے لئے میکدے کا راستہ ہی بدل دیا۔ اس نئے راستے پر انہیں الوداع کہنے بہت سے دوست جمع تھے، میں بھی انہیں دُنیا کے آخری دروازے تک الوداع کہہ آیا ہوں۔

اب ظفر اختر شیرانی، مجاز، منٹو، جگر مراد آبادی، چراغ حسن حسرت، مجید لاہوری۔ نظر حیدر آبادی اور ناصر کاظمی جیسے یاران ہا و ہو اور حوران قبا پوش کے جھرمٹ میں شراب طہور کے جام پر جام لنڈھا رہے ہوں گے۔

نیا میکدہ۔ نئی مے، نئے یاران قدح خوار اور حوران خُلد۔

بڑی دور محفل سجائی ظفر نے

غزل، غزال، صراحی، جام، کتاب، پری چہر گان شب۔ ان سب کو ایک انسانی جسم میں سمو دیا جائے تو اس کا سب سے موزوں نام سراج الدین ظفر ہی ہے۔

فیروز سنز کی دُکان میں ظفر کے گرد چار دیواری کتابوں ہی کتابوں سے چُنی ہوئی تھی، آنکھیں کتابوں ہی میں کھلتی تھیں، کتابوں ہی میں بند ہوتی تھیں۔

محاورتاً نہیں۔ حقیقتاً کتابیں ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھیں،

ذہانت ان کی اپنی بھی بے مثال تھی اور ورثے میں بھی ملی تھی، نانا فقیر محمد ایڈیٹر سراج الاخبار جہلم پنجاب کے اولین اخبار نویسوں میں سے نہایت ممتاز تھے۔ والدہ محترم بیگم زینت عبدالقادر نئے اردو افسانے کے اولین محسنوں میں شمار ہوتی ہیں۔ وہ سراج الدین ظفر کو اتنا چاہتی ہیں کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ عرصہ دراز تک

انہوں نے "والدہ سراج الدین ظفر" کا قلمی نام اختیار کر رکھا تھا۔

ظفر اپنے آپ کو وارثِ مے خانہ حافظ و سعدی بھی کہا کرتے تھے۔ لیکن ان کا اسلوب سب ہی سے الگ تھا۔ چنانچہ ایک بار انہوں نے خود اپنے آپ کو مشورہ دیا تھا۔

ے ڈھونڈو کوئی نئی روشِ شاعری ظفر
اسلوب دوسروں کا گوارا نہیں ہمیں

ظفر میری سیاسی سرگرمیوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ مجھے مشورہ دیتے۔

"سیاست کے بازار اور صحافت کے خارزار سے ادب کے لالہ زار میں لوٹ آؤ۔ ادیب اور شاعر سیاستدان نہیں ہوتا۔"

میں ہمیشہ انہیں یہی جواب دیتا۔

تمہاری منزل قد و گیسو
میری منزل دار و رسن
تمہارا راستہ الگ میرا راستہ الگ۔

سچ پوچھو تو ظفر بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر منزلِ دار و رسن کے مسافر تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنا شہ پارہ "غزال و غزل" مجھے بطور تحفہ دیا تو اس پر یہ شعر لکھا ے

راستہ ایک تھا ہم عشق کے دیوانوں کا
قد و گیسو سے چلے دار و رسن تک پہنچے

محبی ابراہیم جلیس کے لئے

سراج الدین ظفر ۸ ۔ ۴ ۔ ۸ کراچی

پچھلے چند برسوں سے شاید وہ حضرت عزرائیل کی آہٹ پا چکے تھے کم از کم ان کے ان اشعار میں مجھے تو ان کی موت کے فرشتے کی چاپ صاف سنائی دیتی تھی:

اے دوست اس زماں و مکاں کے عذاب میں
دشمن ہے جو کسی کو دعائے حیات دے
یارب سراب اہل ہوس سے نجات دے
مجھ کو شراب دے انہیں آب حیات دے
ہماری طرح کے دنیا میں لوگ کم آئے
کوئی حریفِ گل و مل نہ تھا کہ ہم آئے
عزیزو ہم تو کیا باقی رہیں گے
رہے گا مہ وشوں کا نام باقی

رند خرابات کا پیالہ جیسے جیسے خالی ہوتا جاتا ہے اس کی عمر کا پیالہ بھی ویسے ویسے بھرتا جاتا ہے، چنانچہ اردو شاعری کی شب بغداد کے ابوالحسن

سراج الدین ظفر کا پیمانۂ حیات بھی لبریز ہو گیا اور بالآخر ۶ مئی ۱۹۷۲ء کی صبح ایک دم چھلک گیا۔

ع دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

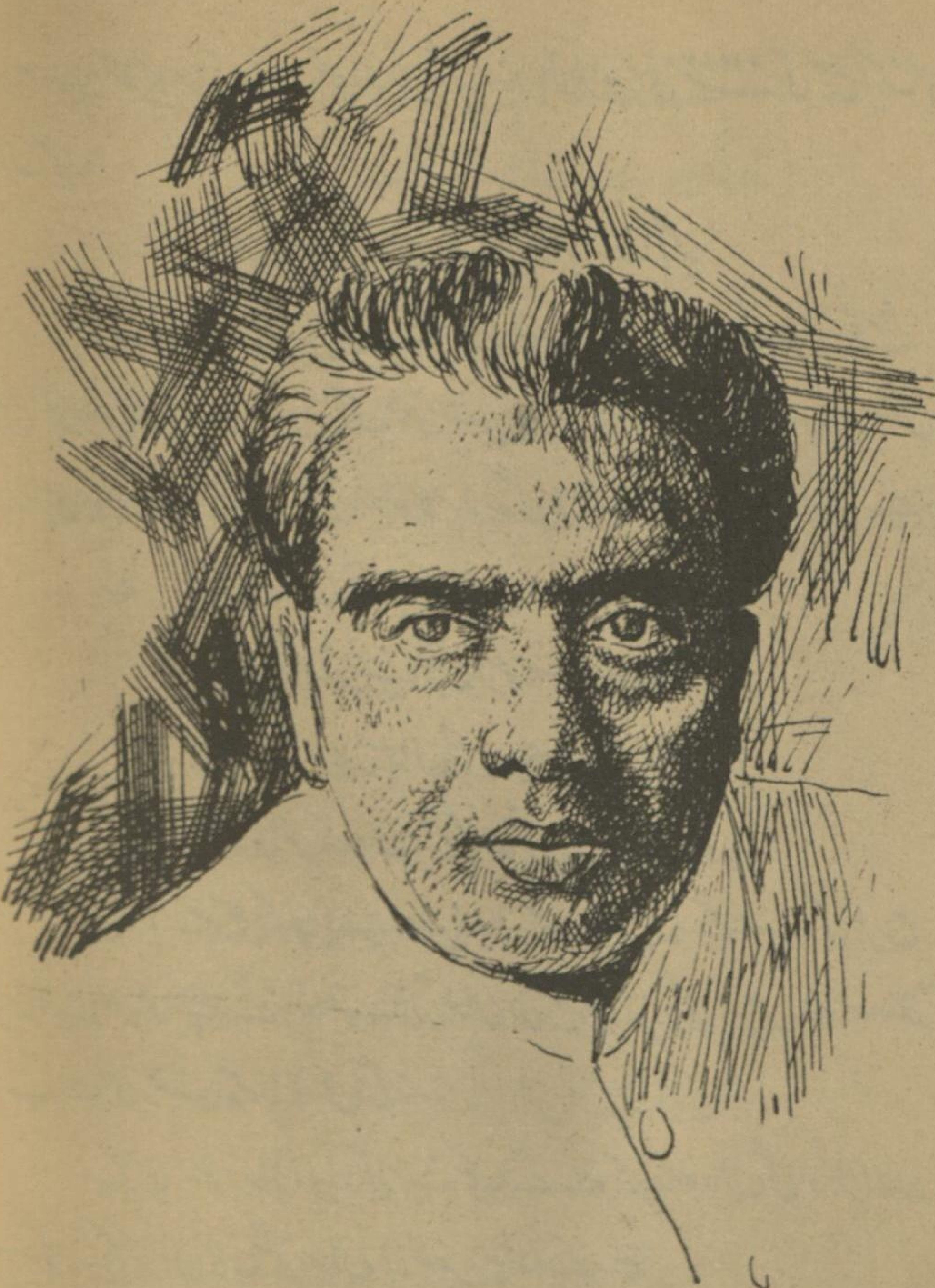
ظفر ۶۱ برس اس دُنیا میں رہے۔ ان کی ساری زندگی خوش حال، خوش پوش، خوش خوراک، خوش رنگ، خوش بودار، خوش اختلاط اور خوش اطوار رہی۔ انہوں نے خود بھی اپنی شاد کام زندگی کا بڑے فخر سے یوں ذکر کیا ہے۔

ع شیدائی خوباں قبا پوش رہے ہم
مشکل سے کوئی شب تہی آغوش رہے ہم
بغیر ساغر و یار جواں نہیں گزرے
ہماری عمر کے دن رائیگاں نہیں گزرے

اس دُنیا سے سبھی کو جانا ہے۔ جلد یا بدیر سبھی چلے جائیں گے۔ سب کی طرح سراج الدین ظفر بھی چلے گئے۔ تعاقب لالہ رُخاں اور تسخیر مہ وشان کی مہم میں وہ حلقۂ شب سے بھی ہمیشہ کے لئے نکل گئے۔

اب زمین پر عروسانِ بہار قیامت تک کے لئے آزردہ رہیں گی اور غزالان حرم سوگوار۔ کیونکہ ان کا عاشق جاں باز ظفر ہمیشہ کے لئے۔

ع ساغر اٹھا کے حد بقا تک پہنچ گیا
"وہ" راہِ بے خودی سے خدا تک پہنچ گیا



خواجہ معین الدین

یہ کیسا جلسہ ہے!

اعلان تو یہ کیا گیا ہے کہ خواجہ معین الدین مرحوم کی یاد میں ایک جلسہ آج منعقد ہو رہا ہے۔

کون خواجہ معین الدین مرحوم۔؟؟؟

مرحوم کا دعائیہ لفظ تو مرنے والے کے نام کے آگے لکھا یا بولا جاتا ہے۔

تعزیتی جلسہ تو کسی مرنے والے کی یاد میں منعقد کیا جاتا ہے۔

یاد تو کسی مرنے والے کی منائی جاتی ہے۔

خواجہ معین الدین پر خدا کی رحمت سدا سایہ فگن رہے ___ مگر اسے مرحوم

تو نہ کہو یارو!

کثرتِ استعمال کے باعث لفظ مرحوم کے معنیٰ ہی بدل گئے ہیں۔ اب تو مرحوم صرف متوفی کو کہا جاتا ہے۔ مرحوم کے ساتھ ہی رحمتِ خداوندی کے بجائے موت کی طرف ذہن رجوع ہو جاتا ہے۔

خواجہ معین الدین تو متوفی نہیں ہے۔ وہ تو صرف نظروں سے اُوجھل ہو گیا ہے۔ زندگی میں بھی تو وہ کب روز آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔!

آج بھی اس کی رفیقۂ حیات، اس کے دوستوں اس کے رشتہ داروں اس کے یاروں اور اس کے پیاروں کے دل پر اس کا نام لے کر دستک دو۔

"خواجہ ـــ پیارے
خواجہ معین"

تو اس کی مانوس آواز صاف سُنائی دے گی۔

"کون ہے ـ! مجھے کون
آواز دے رہا ہے ـ!"

خواجہ معین الدین نے تو صرف نقلِ مقام کیا ہے۔

دُنیا سے اُٹھا تو دل میں اُتر گیا۔ دل میں مچلا تو آنکھوں میں آنسو بن کر اُمڈ آیا۔ کراچی کے شریفوں کی اسم بہ مسمیٰ بستی شریف آباد کے مکان سے نکلا تو یاروں اور پیاروں کی یاد میں آباد ہو گیا۔

وہ چشمِ صورت سے تو اوجھل ہو گیا ہے لیکن چشمِ تصوّر اس کے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں ہے۔

دُنیا کا آخری سورج غروب ہو، قیامت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیلے تب ہی شاید خواجہ معین الدین پھر کبھی نظر نہ آ سکے۔

خداداد صلاحیتوں والا ہر ذہین اور ہر نیک انسان موت سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے۔ ہر نیک انسان کی روح بڑی سُبک اور زندگی بڑی وزنی ہوتی ہے، اسی لئے موت کا فرشتہ اس کا جسم تو بڑی آسانی سے اُٹھا لے جاتا ہے۔ مگر اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ نیک انسان کی زندگی کو بھی اُٹھا کر اپنی گاڑی پر رکھ لے، وہ تھک ہار کر اس کی زندگی کو روزِ قیامت تک کے لئے زمین پر ہی چھوڑ جاتا ہے۔

خواجہ معین الدین کتنا نیک انسان تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے عبادت کے دوران جان دی۔ روزہ تو اس نے زمین پر رکھا لیکن افطار بہشتِ بریں پر خدا کے برگزیدہ انسانوں کے ساتھ کیا۔

جوان آدمی بالعموم نیک نہیں ہوتے۔ خواجہ تو جوانوں میں بھی منفرد تھا۔ وہ زندگی بھر کسی کوچۂ گناہ سے نہیں گزرا۔ اس کی زندگی پر چمکیلا سایہ تھا۔ صرف اس کی رفیقۂ حیات کی زلفوں کا سایہ تھا۔ اس کی زندگی کا راستہ کسی مے کدے سے بھی ہو کر نہیں گزرا۔ اس کی جوانی کے جسم پر تہمت کا ہلکا سا داغ بھی نہیں تھا۔ اس

کا دامن، دامن یوسف تھا۔

بار ہا وہ میکدے میں یارانِ قدح خوار کے درمیان بے جام و سبو بیٹھا رہا۔ صرف یاروں کے لئے اور بار ہا اپنی گرہ سے قرضِ ساقی چکا کر یارانِ بلانوش کی آبرو بھی بچاتا رہا۔

ہر اچھے اور نیک انسان کی طرح خواجہ معین الدین کی زندگی بھی روز اسرافیل تک کے لئے زمین پر ہی رہ گئی ہے۔

زمین پر رہ جانے والی زندگیاں کبھی انسانوں کے گروہ میں ڈھل جاتی ہیں کسی قوم کا قالب اختیار کر لیتی ہیں یا پھر کسی کتاب میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی ہیں، اب خواجہ معین الدین بھی ایک کتاب ہی ہے۔ اب خواجہ معین الدین کسی انسانی جسم کا نام نہیں ہے۔ البتہ اردو ڈرامے کا ایک نیا انسانی نام خواجہ معین الدین ہو گیا ہے۔

کسی بھی کتب خانے کی الماری میں اردو ڈرامے کی کتابوں پر نظر ڈالو۔ تو آغا حشر، حکیم احمد شجاع اور امتیاز علی تاج کے پہلو میں ڈرامے کی جو نئی تازہ کتاب نظر آویز اور دل آویز ہے۔ وہ خواجہ معین الدین ہی تو ہے۔

جب کبھی کسی تھیٹر یا ہال کے اسٹیج کی طرف نگاہ اُٹھے گی تو خواجہ معین الدین کی پرچھائیں بھی صاف نظر آتے گی۔

وہ ہر موقع پر یاد آتا رہے گا۔ روز تو زندہ لوگ بھی یاد نہیں آتے۔

کل میرے اور معین کے دو نہایت پیارے دوستوں غلام صمدانی اور عزیز کارٹونسٹ نے مجھ سے شکایت کی کہ :-

" میں نے معین کی وفات پر اب تک کوئی مضمون کیوں نہیں لکھا۔!"

میں نے مسکت جواب دیا۔

" معین مرے تو میں اس کی موت پر کوئی مضمون بھی لکھوں۔!"

مجھے تو معین کی موت صور اسرافیل ہی میں چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔

دُنیا مرے تو معین بھی مرے۔

کیوں میں نے ٹھیک کہا نا خواجہ معین الدین !!

۱۷ سال ۱۷ دن

پاک و ہند جنگ ستمبر ۶۵ء

چھ ستمبر کا مقدس، تاریخی، یادگار اور خوشیوں سے جگمگاتا دن ہے۔

میرا عظیم وطن پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوا اور ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کے مبارک اور مقدس دن زندہ جاوید ہوگیا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے دن دنیا کے نقشے پر روشنائی سے پاکستان کی سرحدوں کی لکیریں کھینچی گئیں تھیں لیکن ۶ ستمبر کے دن سے ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کے دن تک پورے سترہ روز پاکستان کے جانثار جوانوں نے پاکستان کی ان سرحدی لکیروں کو اپنے گرم اور سرخ لہو سے اور زیادہ گہری، اور زیادہ سرخ اور قیامت کے دن تک کے لئے اَن مٹ بنادیا ہے۔

پاکستان کو حیاتِ جاوداں عطا کرنے کے لئے اس کی سرحدوں کی لکیروں کو روشنائی کی نہیں بلکہ اس کے سرفروش جوانوں کے جوان، گرم اور سرخ لہو کی ضرورت تھی، اور یہ تاریخ عالم ہی کا فرمان ہے کہ

"جس ملک کی سرحد کی لکیریں اس کے نوجوانوں کے لہو سے سینچی
اور کھینچی جاتی ہیں اس ملک کی سرحدوں کو صورِ اسرافیل کے سوا تے
اور کوئی نہیں مٹا سکتا۔"

۶ ستمبر کا دن مبارک و مسعود دن ہے۔ یہ دن صرف غازیوں اور شہیدوں کا دن ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس دن پاکستان کے اُفق سے جو سورج طلوع ہوا۔ وہ سورج نہیں ہے بلکہ وہ کسی شہید کا جگ مگ جگ مگ چہرہ تھا "یہ آفتاب چہرہ" کس شہید کا ہے؟ یہ آفتاب چہرہ ہر اُس پاکستانی شہید کا نورانی چہرہ ہے جس نے کوہستان ہمالہ کے دامن میں ظلم، انسان نما درندگی اور سامراج کے اندھیرے کو بڑی ذلت آمیز، بڑی عبرتناک اور آخری شکستِ فاش دیدی ہے۔

ظلم کی فوج بہت بڑی تھی، حق کی فوج بہت چھوٹی تھی، لیکن بہت چھوٹا ہی تو بہت بڑے اندھیرے کی موت ہوتا ہے!

ظلم اور سچائی کی لڑائی۔ اندھیرے اور سورج ہی کی لڑائی ہوتی ہے۔
بھارت اور پاکستان کی لڑائی بھی گویا اندھیرے اور سورج ہی کی لڑائی تھی۔
دُنیا کی تاریخ نے تو ماضی میں یہ گواہی دی تھی کہ

ع اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور اب دُنیا کی تاریخ مستقبل کے لئے یہ پیش گوئی کر رہی ہے کہ

"پاکستان بھارت سے جنگ کے بعد زندہ جاوید ہو گیا ہے"

یہ عجب حسن اتفاق ہے۔ جنگ کے وقت پاکستان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

اور جنگ بھی صرف ۱۷ دن تھی۔

اور میں نے بڑی حیرت اور مسرت کے ساتھ دیکھا ہے کہ پاکستان ۱۷ سال میں بھی اتنا طاقتور، ایسا متحد اور ایسا مضبوط بنا جتنا کہ صرف ۱۷ دن کے اندر ایک لوہے کی دیوار بن گیا۔

کہاں تو بھارت کی فوجیں پاکستان کے وجود کو (خاکم بدہن) مٹا کر اکھنڈ بھارت بنانے چلی تھیں، اور کہاں وہ پاکستان کو ابدالآباد تک "اکھنڈ پاکستان" بنا کر اور منہ کے بل گرتی پڑتی چیختی کراہتی لوٹ گئیں۔

میں جنگ سے نفرت کرتا ہوں۔

میں جنگ سے محبت بھی کرتا ہوں۔

میں اس جنگ سے نفرت کرتا ہوں جو جنگ آزاد انسانوں کے ہاتھوں اور پیروں میں انہی جیسے انسانوں کی غلامی کی بیڑیاں پہنا دیتی ہے، جو جنگ انسانوں کے ہونٹوں سے مسکراہٹ، اس کے گلے کا نغمہ اور اس کی آنکھوں کے خواب چھین لیتی ہے۔

جو جنگ معصوم بچوں کے سروں سے باپ کا سایہ عفت مآب کنواریوں کے سروں سے حیا کے دوپٹے اور دلہنوں کی زلفوں سے سہاگ کے جھومر نوچ لیتی ہے، جو جنگ باپ کے ہاتھ سے بڑھاپے کا جوان سہارا گرا دیتی ہے جو جنگ ماؤں کی دودھ بھری چھاتیوں کو خشک اور ان کی مامتا بھری، ہری بھری کوکھ کو اجاڑ دیتی ہے، جو جنگ جوان جسموں سے لذت آگیں ہم آغوشی کو لوٹ لیتی ہے، جو جنگ آزاد انسانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنے پیچھے برسوں کے لمحہ بہ لمحہ جمے جمائے سجے سجائے گھروں کو آناً فاناً میں ملبہ بنا دیتی ہے اور جو جنگ اپنے پیچھے دکھوں سے کراہتی اور آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ایسی بھیانک بیوہ اور یتیم زندگیاں چھوڑ جاتی ہے جس کے مقابلے میں موت کی نہایت بدصورت چڑیل بھی ایک حسینۂ جہاں تاب نظر آنے لگتی ہے۔

میں اس جنگ سے محبت کرتا ہوں جو جنگ انسانوں کو انہی جیسے انسانوں کی غلامی سے نجات دلاتی ہے۔ جس کے توپوں سے نکلنے والی آگ غلامی کی بیڑیوں کو پگھلا دیتی ہے۔ میں اس فوج سے بھی محبت کرتا ہوں جس کی قطار نہتے اور معصوم انسانوں کے گھروں کی دیوار بن جاتی ہے۔ میں اس سپاہی سے بھی پیار کرتا ہوں جس کی مشین گن اُن قزاق ہاتھوں کو زخمی اور مفلوج کر دیتی ہے جو ہاتھ کنواریوں کی حیا کے دوپٹے، سہاگنوں کے سہاگ کے جھومر، باپوں کے عصائے پیری، ماؤں کی بھری گودیاں اور جوان جسموں سے ہم آغوشی کی لذت لوٹنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔

میں اس رائفل بردار ہاتھ کو چومتا ہوں جو سہاگنوں کی سرخ چوڑیوں کو ٹوٹنے سے

بچاتا ہے۔ میں اس ہوائی جہاز کو سلام کرتا ہوں جس کی چھاؤں ایک بچے کے سر پہ باپ کا سایہ ایک کنواری کے سر پہ آبرو کا دوپٹہ اور ایک عورت کے سر پہ سہاگ کا آنچل ہے۔

اسی انسانی فوج کا عرف عام پاکستانی فوج ہے۔ اور میں

آج پاکستان کی اسی محسن فوج کو بڑے فخر سے سلام کرتا ہوں۔

آج مجھے اپنی ساری زندگی کے سب سے زیادہ قیمتی وہ ۱۷ دن یاد آرہے ہیں جب پاکستان کے دشمن لاہور کے جیم خانہ کلب میں وہسکی کے چھوٹے چھوٹے پیگ پینے کے لئے نکلے تھے اور اب پتہ نہیں کہ ذلت اور شکست کے کن تہہ خانوں میں پڑے زندگی بھر کیلئے اپنے ہی لہو کے گھونٹ پی رہے ہیں۔

وہ ۱۷ دن جو ہر پاکستانی کی زندگی کا حاصل ہیں، اور وہ ۱۷ راتیں جب پاکستان میں ایمان کے چراغ کے سوائے اور کسی چراغ کی بھی روشنی نہ تھی۔

ان دنوں پاک فضائیہ کا جب کبھی کوئی ہوائی جہاز آسمان پر نمودار ہوتا تو میں اپنے آپ کو بھول کر ایک بچے کی سی بے تابی کے ساتھ ڈوڑتا ہوا صحن میں آجاتا اور اس ہوائی جہاز کو سلام کرتا۔

میں نے اپنی زندگی میں اب تک نہ تو شاہین کو دیکھا ہے اور نہ عقاب کو —— لیکن جب سے میں نے پاک فضائیہ کے دشمن کش طیاروں کو دیکھا ہے۔ اب نہ مجھے عقاب کو دیکھنے کی تمنا ہے اور نہ شاہین کو دیکھنے کی خواہش۔

اب تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان کی "اقبال مند" قوم کے آولین

معمار اقبال کا شاہین بھی گویا اسی پاک فضائیہ کے طیارے کا ابتدائی نام تھا۔

میں نے سمندروں کے سورماؤں کی بہت سی کہانیاں بچپن میں پڑھی تھیں، لیکن جب میں نے پاک بحریہ کے جانبازوں کو دیکھا تو خوشی اور مسرت سے حیران رہ گیا کہ سمندروں کے وہ سارے سورما میری نظروں کے سامنے ہیں۔

جنگ کے دوران ایک رات جنگل میں پاکستانی سرحد پر ایک جگہ ایک خندق میں مستعد اور چوکنا کھڑے بری فوج کے ایک کڑیل جوان کو دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا۔

اس وقت آدھی رات تھی، اور ہلکی ہلکی سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

وہ جوان خاکی وردی میں ملبوس تھا جو وطن کی خاک پاک کی ہم رنگ تھی۔

وہ خاکی وردی جو لہو کے سوائے اور کسی رنگ سے رنگی ہی نہیں جا سکتی۔

اُس وقت پاکستان کے دس کروڑ انسان گہری میٹھی نیند سو رہے تھے، ایسے بے خبر سو رہے تھے کہ کسی کو پتہ بھی نہ تھا کہ ان کی نیند کس کی بیداری ہے اور کس کی بیداری ان کی گہری میٹھی نیند!

وہ نوجوان خندق میں مورچہ سنبھالے کھڑا اپنے دس کروڑ ہم وطنوں کی نیندوں کی امانت پر پہرہ دے رہا تھا۔

نیندوں کو خود فراموشی میں کسی پاکستانی کا دھیان اپنے اس محسن سپاہی اور اس محسن محافظ کی طرف نہیں تھا۔ لیکن اس کا دھیان ہر پاکستانی کی طرف تھا۔ وہ دس کروڑ انسانوں کے لئے جاگ رہا تھا۔ لیکن اس کے لئے کوئی نہیں جاگ رہا تھا۔

وہ اس لئے جاگ رہا تھا کہ دس کروڑ انسانوں کی قسمت کہیں نہ سو جائے۔

وہ اس لئے جاگ رہا تھا کہ رات کے اندھیرے میں دشمن کا ناپاک قدم ——
آزاد، اجلی اور پاک سرزمین پر کہیں کلنک کا دھبہ نہ ڈال دے۔

آبادیوں کا وہ محافظ، زندگی کی ساری لذتوں، خوشیوں اور بہاروں کو الوداع
کہہ کر بھیانک اور سنسان جنگل میں یکہ و تنہا کھڑا ہے۔
اُس کے جوان جسم کے لئے آبادیوں میں ایک سے ایک لذیذ کشش موجود تھی۔
وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے سامنے موت کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔
لیکن پھر بھی وہ پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتا تھا کہ کہیں آبادی کی کوئی لذیذ کشش
اس کے قدموں کو نہ کھینچ لے اور اس کے ہاتھ میں وطن کی حفاظت اور دس کروڑ انسانوں کی
زندگی کی جو امانت ہے اس میں خیانت نہ ہو سکے۔

وہ سینہ سپر کھڑا تھا کیونکہ بندوق کی گولی نے آج تک کسی پاکستانی جوان کی
پیٹھ دیکھی ہی نہیں ہے۔

اس سپاہی نے اپنی بیوی، اپنے بچے، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنے بھائی اور اپنی
بہن سے پیار کے سارے ناتے توڑ کر وطن کی مقدس سرحد سے ایک نیا۔ ایک مقدس اور
اٹوٹ رشتہ جوڑ لیا تھا۔

یہ سرحد جیسے اس کے بچّے کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ہے۔ اس کی ماں کی بانہوں
کا ہار ہے اس کے باپ کی شفقت کا ہاتھ ہے۔ اس کے بھائی کا بندھا ہوا امام ضامن ہے،

اس کے بہن کے پیار کی مالا ہے۔ اور گویا یہ سرحد اُس کی دُلھن کی زلفوں کی چمکیلی سیندور افشاں بھری مانگ ہے۔

یہ سپاہی وہ ستون ہے جس پر پاکستان کی چھت قائم ہے۔

یہ سپاہی وہ مینار ہے جس سے پاکستان کا تقدس فضا میں بلند ہے۔

میں نے پاکستان کے وقار کے اس مینار کے آگے بڑی عقیدت سے اپنا سر جھکا دیا۔

بھارت سے پاکستان کی وہ جنگ میرے لئے گویا تاریخ عالم کا ایک آئینہ تھی، اس ۱۷ روزہ چھوٹی سی جنگ میں، میں نے سقراط، منصور، صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم اور شیردل ٹیپو کو پاکستانی فوج کی وردی میں دیکھا ہے۔

دُنیا کے آغاز سے اب تک دُنیا میں جتنی بھی جنگیں لڑی گئی ہیں، میں نے ان سب جنگوں کی جھلک اس جنگ میں دیکھی ہے جو جنگیں حق و باطل کے درمیان لڑی جاتی رہی ہیں۔

اس جنگ میں سکندر اعظم اور راجہ پورس کے درمیان لڑی جانے والی جنگ کی جھلک بھی تھی۔

سلطان ٹیپو کے بارے میں، میں نے صرف پڑھا ہی تھا کہ اس نے غیر ملکی حکومت کے سامنے غلامی کا سر جھکانے کے بجائے آزادی کے غرور سے اپنا بلند سر دشمن سے لڑتے ہوئے کٹوا دیا۔

اور اس جنگ میں، میں نے میجر راجہ عزیز بھٹی کے روپ میں سلطان ٹیپو کو بھی دیکھ لیا

میجر بھٹی نے بھی غیر ملکی حکومت کے آگے سر جھکانے کے بجائے موت کو سینے سے لگالیا تھا
میں نے سچائی کا سر بلند کرنے کے لئے سقراط کو زہر کا پیالہ پیتے تو نہیں دیکھا البتہ
میں نے سچائی کے سبز ہلالی پرچم کو بلند رکھنے کے لئے اپنے پیارے دوست میجر
ضیاءالدین عباسی کو نہایت خوشی اور فخر سے موت کا پیالہ پیتے دیکھ لیا ہے۔

میں نے پھانسی کے تختہ پر منصور کا نعرہ انا الحق نہیں سُنا البتہ ۸ ستمبر کی صبح جب
دشمن کی فوج پاکستان کے ایک سرحدی گاؤں ہڈیارا کی مسجد میں داخل ہوئی اور جب اس
مسجد کے ۷۱ سالہ بوڑھے پیش امام کے سینے پر بھری بندوق داغ دی گئی تو میں نے اور
ساری دُنیا نے دوسری بار نعرہ انا الحق

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ

انتہائی گرج کے ساتھ سُن لیا اور اس نعرہ انا الحق کی آواز دشمن کی بندوق کی آواز
سے بھی گرجدار تھی۔

روس کی تاریخ میں میں نے اسٹالن گراڈ کی مشہور عالم لڑائی کا حال پڑھا۔ لیکن
اب میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے مقدس وطن میں دو اسٹالن گراڈ دیکھے۔

"لاہور اور سیالکوٹ"۔

اب جب میں سوچتا ہوں کہ روس کے پاس تو صرف ایک سٹالن گراڈ ہے اور
پاکستان میں دو اسٹالن گراڈ تو میری گردن خوشی اور فخر سے تن جاتی ہے۔

میں نے قصہ کہانیوں میں اور لوک گیتوں میں پڑھا تھا کہ غیور ماں اپنے بیٹے کو جنگ

کے لئے الوداع کہتے ہوئے نصیحت کرتی ہے۔

"بیٹا۔ اگر تو نے پیٹھ پر گولی کھائی تو میں تجھے اپنا دودھ نہیں بخشوں گی۔"

اور اب میں نے ان کہانیوں اور لوک گیتوں کی غیور ماں کو راجہ عزیز بھٹی کی ماں اور غیرت مند بیوی کو میجر عباسی کی نوجوان بیوہ کے روپ میں دیکھ لیا ہے۔ پاکستان کے ہر شہید کی ماں ایسی ہی دلیر اور پاکستان کے ہر شہید کی بیوہ ایسی ہی شیرنی ہے۔

یہ وہ قوم ہے جس کی مائیں اپنے شہید بیٹوں کی لاشوں کو ٹٹولتی ہیں کہ دودھ بخشنے سے پہلے دیکھ تو لوں کہ کہیں میرے بیٹے نے پیٹھ پر تو گولی نہیں کھائی!

یہ وہ قوم ہے جس کی بیویاں اپنے شوہروں کی آنکھوں میں جھانکتی ہیں کہ کہیں مرتے وقت ان کے شوہروں کی آنکھوں میں دشمن کے چہرے کے بجائے بیوی کے چہرے کا عکس تو نہیں تھا!

یہ وہ قوم ہے جس کا بچّہ اپنے شہید باپ کی لاش کے پاس کھڑے ہو کر اپنی سوگوار ماں کو یاد دلاتا ہے کہ

"امی۔ ابو نے کہا تھا کہ اگر میں شہید ہو جاؤں اور تمہاری آنکھوں میں آنسو آجائیں گے تو مجھ پر جنّت کے دروازے بند ہو جائیں گے۔"

جس قوم کے جیالے بیٹے اس طرح فخر، خوشی اور مسکراہٹ کے ساتھ شہادت کا جام پی لیتے ہیں وہ قوم دنیا کے آخری غروب آفتاب تک بھی نہیں مر سکتی۔

۶ر ستمبر ہی کا تو وہ دن تھا جب مادرِ وطن نے اپنے بیٹوں سے امتحانِ وفا لیا تھا۔

ان شہیدوں کو سلام کرتے ہیں جن کی موت پاکستان کی حیاتِ جاوداں بن گئی ہے اور جو شہید ہی اس لئے ہوئے تھے کہ پاکستان زندہ جاوید ہو جائے!

شہیدو۔ ہمارا سلام قبول کرو۔

قاہرہ کا حادثہ

چراغ تو ۲۱ گھروں کے بجھے لیکن غم کا بھیانک اندھیرا سارے ملک میں پھیل گیا ہے۔
ان چراغوں کے بجھتے ہی غم کے ڈراؤنے اندھیرے میں آنسوؤں کے بے شمار ان گنت ستارے ٹمٹمانے لگتے ہیں۔

لیکن ستاروں سے بھی اندھیرا کہیں دور ہوتا ہے؟

سارا آسمان ستاروں سے بھرا ہوا ہو، تب بھی تو اندھیرا دور نہیں ہوتا۔!

غم کے اس بھیانک اندھیرے میں کوئی سجھائی نہیں دیتا۔ کوئی گھر دکھائی نہیں دیتا۔ میں کس کے گھر جاؤں؟ کس کس کے آنسو پونچھوں، کس کس کے سروں پر ہاتھ پھیروں؟

غم کے اتنے گہرے اندھیرے کے باوجود ہر رونے والا — آنسو پونچھنے والے

کو فوراً پہچان لیتا ہے، جبھی تو میرے بھائی ناصر محمود کی صرف پانچ مہینے کی سُہاگن بیوہ
چیخ پڑی ہے کہ

"مجھے دلاسہ نہ دو — مجھے دلاسہ نہیں چاہیئے، مجھے میرا سہاگ
چاہیئے، میرا سُہاگ واپس دلا دو۔"

علیم اللہ جس کا اس ملک میں بلکہ اس ساری دُنیا میں اس کی بیوہ اور چھ ننھے
ننھے بچوں کے سوائے اور کوئی نہیں ہے۔ اس کا ننھا ناسمجھ بچّہ تک میرے اجنبی ہاتھ کو پہچان
لیتا ہے، میرے ہاتھ کو اپنے سر سے جھٹک دیتا ہے۔ اور مچل اُٹھتا ہے۔

"نہیں نہیں۔ یہ میرے بابا کا ہاتھ نہیں ہے۔"

جعفر منصور کی بوڑھی ماں کہہ رہی ہے۔

"ہاں تم بھی میرے بیٹے ہو۔ لیکن میری گود تو صرف جعفر منصور سے
بھر سکتی ہے۔"

انیس ہاشمی زخمی شیر کی طرح گرج رہا ہے۔

"تم اکیلے کیوں آئے ہو۔؟ جاؤ حمید ہاشمی کو بھی ساتھ لیتے آؤ۔
اس سے کہو کہ تو آنکھوں میں آنسو بھر کر تو چلا گیا۔ لیکن یہ آنسو پونچھنے خود
کیوں نہیں آتا۔؟"

آنسو پونچھنے کے لئے جس غم کدے پر جاتا ہوں، باہر ہی سے دھتکار دیا جاتا ہوں
کہ لوٹ جاؤ اور اسے لے آؤ جو بھرے پرے جگ مگ گھروں میں غم کا اندھیرا اور آنسوؤں

کے ٹمٹماتے ستارے بکھیر کر چلا گیا ہے۔

مائیں۔ اُجڑی گودیوں کی بہاریں مانگ رہی ہیں بچے۔ سایۂ پدری طلب کر رہے ہیں۔ بہنیں۔ بھائیوں کی راہ تک رہی ہیں۔ دلہنیں۔ اپنے سہاگ مانگ رہی ہیں۔

ہم ایک آنسو نہیں پونچھ سکتے تو سہاگ کا جھومر سایۂ پدری اور اُجڑی گود کی بہار کہاں سے لا سکتے ہیں۔

اسی لئے میں ناصر محمود، حمید ہاشمی اور جعفر منصور کے گھروں سے آگے نہیں گیا۔ آگے ابھی اور بہت سے پیاروں کے گھر ہیں۔ میجر جنرل حیاءالدین کا گھر، اے کے قریشی، ام بی خالد، سبط فاروق، ممتاز طارق، یٰسین ترین، شاہ ممتاز، ابوصالح اصلاحی۔ عرفان چغتائی صغیرالدین احمد اور کوئی مزید سوا سو گھر ہیں۔ ان سارے گھروں میں ہر آنکھ میں آنسو ہیں اور جب بھی کوئی ہوائی جہاز ان گھروں پر سے گزرتا ہے، اپنا رونا بھول کر ننگے پاؤں صحن میں دوڑتے آتے ہیں، ہوائی جہاز کو دیکھ کر چیخنے لگتے ہیں۔

حمید ہاشمی کو آواز دیتے ہیں۔

ناصر کو پکارتے ہیں۔

جعفر منصور کو صدا لگاتے ہیں۔

لیکن یہ آوازیں نہ ہوائی جہاز تک پہنچتی ہیں اور نہ آسمان تک پہنچ سکتی ہیں!

اور یہ ہوائی جہاز وہ ظالم ہوائی جہاز تو نہیں ہے جو اپنے پیاروں کو قاہرہ لے جاتے کے بہانے آسمانوں کی طرف لے کر چلا گیا۔

اب نہ وہ ہوائی جہاز واپس آئے گا۔ نہ ناصر محمود واپس آئے گا۔ نہ حمید ہاشمی نہ جعفر منصور۔

کس کس کے نام لوں۔ ؟ ان تین چار ناموں کے بعد ہی تو گلا رندھ جاتا ہے۔ آواز آنسوؤں میں اسی طرح ڈوب جاتی ہے، اسی طرح مر جاتی ہے، جس طرح نیل کے ساحل کی ''وادی ال ہلازونی'' کی آگ میں ۱۲۱ ہنستے مسکراتے میرے اور آپ کے، اور سارے پاکستان کے پیارے بھائی بہنیں اور بچے ڈوب گئے، مر گئے۔

سب کچھ تباہ ہو گیا۔ سب کچھ خاکستر ہو گیا۔

صرف ننھی یاسمین کی گڑیا کا مسکراتا چہرہ باقی رہ گیا۔ باقی سب کچھ تباہ ہو گیا۔

رات تو ہر شام ہی آتی ہے۔ لیکن ۱۹ مئی کی رات جیسی رات پھر کبھی نہ آئے۔ اور خدا کرے ایسی جیسی رات پھر کبھی نہ آئے۔ ۱۹ مئی کی کالی رات جو سہاگنوں پر ہمیشہ کے لئے پھیلا گئی۔

۱۹ مئی کی رات کا اندھیرا کتنا گہرا اندھیرا تھا کہ اس اندھیرے میں کتنے معصوم بچے اپنے باپوں سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے۔ اس اندھیرے میں کتنی بہنوں کے بھائی کھو گئے؟ کتنی ماؤں کی گود اُجڑ گئیں؟ کتنے باپوں کے عصا ہائے پیری چھن گئے۔

اس قزاق رات کو سہاگنوں کے جھومر ان کی ہتھیلیوں کی مہندی، ان کی مانگوں کی افشاں اور ان کے سروں کے سُرخ دوپٹے چھین لئے۔

لیکن کراچی کے ہوائی اڈے پر تو اندھیرا نہیں تھا۔ کراچی کا ہوائی اڈہ تو بڑا

جگ مگ تھا۔ اتنی روشنیاں کہ موت کی ہلکی سی بھی تو پرچھائیں نہیں تھی۔

لیکن اب میں شاہ ممتاز۔ حمید ہاشمی، ناصر محمود اور جعفر منصور کی آخری باتوں کو یاد کرتا ہوں تو اب یقین ہو جاتا ہے کہ ان سب نے موت کے قدموں کی چاپ سُن لی تھی، یا تو انہوں نے ہمیں بتانا مناسب نہ سمجھا۔ یا پھر انھیں خود بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ جو قدموں کی چاپ ہے وہ ان کی موت کے قدموں کی چاپ ہے۔ البتہ انہوں نے غیر شعوری طور پر تو بتا دیا تھا کہ

"...... وہ قاہرہ تک نہیں قاہرہ سے بھی بہت آگے۔ اتنے آگے جا رہے ہیں جہاں سے کوئی نہیں واپس آتا۔"

شاہ ممتاز سے اس کے ایک دوست نے کہا۔

"مُبارک ہو۔ تم پہلی بار بیرونِ پاکستان کے سفر پر جا رہے ہو۔"

شاہ ممتاز نے جواب دیا۔ یا پھر اس کے منہ سے موت کی زبان بلی ہو کہ

"کیا پتہ کہ یہ میرا سفر پہلا بھی ہو اور آخری بھی"۔

نیوی گیشن افسر خالد لودھی کی دُلھن اسے مجبور کر رہی تھی کہ۔

"تم قاہرہ نہ جاؤ۔ ہم پکنک پر ہالے جی جائیں گے"۔

ضدی خالد لودھی اپنی ضد پر اڑا رہا کہ۔

"نہیں۔ میں قاہرہ جاؤں گا"۔

فلائٹ پر سر جیلانی کی شادی کی دوسری سالگرہ ۲۰ مئی کو تھی، اس کی دُلھن کا

اصرار تھا کہ

"ہم شادی کی دوسری سالگرہ منائیں گے۔ پھر تم قاہرہ چلے جانا"

لیکن فلائٹ پر سر جیلانی کی موت دوسری طرف سے بول رہی تھی۔

"ڈارلنگ" یہ افتتاحی پرواز ہے۔ جیلانی کا جانا ضروری ہے"۔

حمید ہاشمی کا ہاتھ دیکھنے کے بعد مشہور پامسٹ صحافی بادشاہ حسین حیدرآبادی نے انھیں مشورہ دیا کہ

"آپ کی زندگی میں کوئی بہت بڑا حادثہ ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ اپنا قاہرہ کا سفر منسوخ کر دیں"

لیکن حمید ہاشمی قہقہہ مار کر ہنسنے لگا اور بولا۔

"بادشاہ جی ایک ورکنگ جرنلسٹ کی زندگی سے بڑا حادثہ اور کیا ہو سکتا ہے؟"

ہمیشہ حادثات میں گھرا رہنے والا حمید ہاشمی پانچ ننھے بچوں اور حاملہ بیوی کو زندگی میں پہلی بار چھوڑ کر پہلی بار ملک سے باہر جانے کے لئے انارکلی کے گھر سے نکلا۔ لاہور سے نکلا۔ کراچی سے نکلا اور پھر ہمیشہ کے لئے دُنیا سے بھی نکل گیا۔

اب نہ وہ اپنے پیدا ہونے والے بچے کو دیکھ سکے گا۔ اور نہ اس کا پیدا ہونے والا بچّہ اسے دیکھ سکے گا۔ اس کا پیدا ہونے والا بچّہ تو پھر بھی اس کی تصویر دیکھ سکے گا۔ لیکن حمید ہاشمی تو نہ اس کھلنے والے پھول کا رنگ دیکھ سکے گا۔ اور نہ اس کی مہک سونگھ سکیگا۔

بچھڑنے والے بہت سے ساتھیوں کا بیرونی ملک کا یہ پہلا سفر تھا۔ حمید ہاشمی ناصر محمود، جعفر منصور، علیم اللہ، سبط فاروق، فریدی، شاہ ممتاز، عبدالحنان، ٹی ڈی سلوا، یٰسین ترین عرفان چغتائی اور صغیر الدین احمد کو زندگی میں پہلی بار پاسپورٹ ملے تھے۔

سب یہی کہتے تھے کہ یہ "انٹرنیشنل پاسپورٹ" ہیں لیکن کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ انٹرنیشنل پاسپورٹ نہیں یہ تو صرف "آسمان کا پاسپورٹ" ہے یا پھر "جنت کا پاسپورٹ ہے"

ہر شخص نے غیر شعوری طور پر اپنے پہلے "سفر" کی ایسی ہی تیاریاں کیں جیسے کوئی "آخری سفر" کی تیاری کرتا ہے۔

•

کتنی کتنی دن سے ایک ایک چیز خریدی جا رہی تھی، اکٹھی کی جا رہی تھی، جیسے وہ دُنیا لپیٹ رہے ہوں،

اور جعفر منصور نے تو کمال ہی کر دیا وہ اپنا کفن بھی ساتھ لے گیا۔ ہم سے تو یہ کہہ گیا کہ

"قاہرہ سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جاؤں گا۔ عمرے کی سعادت حاصل کروں گا اور اپنے کفن کو آبِ زمزم میں بھگو کر لے آؤں گا تاکہ جب بھی دُنیا چھوڑنی پڑے تو سیدھا جنت میں جا سکوں۔"

لیکن کفن ہونے کے باوجود بے کفن ہی جنت میں چلا گیا۔

یہ پیارے جو بچھڑ گئے۔ دوستوں کی تکلیف کا کتنا خیال رکھتے تھے، مرے بھی تو اس طرح کہ دوستوں کے کندھے کا بوجھ بننا تک گوارہ نہ کیا۔ قبر کے لئے جگہ ہوئی تو اتنی دور کہ

دوستوں کو پھول خریدنے کی بھی زحمت نہ اُٹھانی پڑے۔

دُنیا سے اُٹھے بھی تو بغیر جنازے کے اُٹھے۔

یہ صحافی، ساتھی زندہ رہے بھی تو اکٹھے زندہ رہے، مرے بھی تو اکٹھے مرے، نہ صرف خود جامِ شہادت پیا بلکہ صحافیوں کے اتحاد کو بھی آبِ حیات پلا گئے۔

ان محبِ وطن ساتھیوں کو وطن کی آغوش میں تو جگہ نہ ملی لیکن ان کے جسم صرف وطن ہی کو نہیں بلکہ عالمِ اسلام کو نئی زندگی بخش کر ساکت و صامت ہو گئے ہیں۔

ان کی لاشیں متحدہ عرب جمہوریہ کی سرزمین میں پاک اور عرب عوام کی دوستی کے بیجوں کی طرح بو دی گئی ہیں۔

انہوں نے پاکستانی عوام اور عرب عوام کی از سرِنو اور دوامی دوستی کے راستے میں اپنی جانیں دیدی ہیں۔

ان کا لہو عرب اور پاکستانی عوام کی دوستی کے پودے کو سینچے گا۔

ان کے جسموں کی راکھ عرب اور پاکستانی عوام کی دوستی کے راستے پر اس لئے بکھر گئی ہے کہ عرب اور پاک عوام کی دوستی کے نقشِ قدم ابھر آئیں۔

مصر کی زمین میں ان پاک باشندوں کے جسم عرب اور پاکستانی عوام کی دوستی کی بہت بڑی امانتیں ہیں۔

انہوں نے متحدہ عرب جمہوریہ کو اپنا لہو دیا۔

انہوں نے پاکستان اور متحدہ عرب جمہوریہ کو لہو کے رشتہ سے باندھ دیا۔

لہو کا رشتہ۔ جو اٹوٹ ہوتا ہے۔

یہ پیارے لوگ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

پی آئی اے کے اشتہارات، ٹکٹوں اور کیلینڈر پر جب بھی ہنس مکھ موی گل کی دلاویز تصویر نظر آئے گی۔ اور جب کبھی ہمارے گھروں پر سے کوئی ہوائی جہاز گزرے گا تو ان پیاروں کے آنسو ہی آنسو اُمڈ آئیں گے۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ موت انسان کو آنسو کی صرف ایک بوند میں سمیٹ لیتی ہے۔

اتنا بڑا انسان۔!؟

اور اس کا انجام۔ صرف ایک آنسو!!

تین لاشیں

(ویت نام کی جنگ)

میری نظروں کے سامنے اس وقت تین لاشیں ہیں۔

پہلی لاش ایک بڑے ہی معصوم چہرے والی نہایت نوعمر ویت کانگ لڑکی کی لاش ہے، جو سیگاؤں کے ایک مکان کی چھت پر پڑی ہے۔ اس لڑکی کے ہاتھ ایک مشین گن کی لبلبی پر ہیں، اس کے جسم پر کوئی گرم وردی نہیں ہے، صرف ایک سوتی قمیض ہے جو شاید سفید رنگ کی تھی، لیکن اب سُرخ سُرخ سیاہ اور چھلنی ہو گئی ہے۔ اس کا نچلا جسم ایک سیاہ پاجامے سے ڈھنکا ہوا ہے۔ اس کے پیروں میں کوئی فوجی بوٹ نہیں ہیں، بلکہ اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ننگے ہیں، اور اس کے تلوؤں میں بڑے بڑے چھالے پڑے ہیں، جیسے وہ کوسوں میلوں دور سے پیدل چلتی کہیں سے آئی ہو۔

اس کی انگلیوں میں کوئی انگوٹھی نہیں ہے یعنی وہ شادی شدہ ہے اور نہ منگیتر۔
لیکن اس لڑکی سے ناواقف ہونے کے باوجود میں اس لڑکی کے "محبوب" سے بڑی اچھی طرح واقف ہوں اور اب یہ بھی جان گیا ہوں کہ اس لڑکی نے اپنے محبوب کی زندگی کے لئے اپنی زندگی لٹا دی ہے، اس باوقار دوشیزہ نے اپنے محبوب کی زندگی پر سے اپنی ننھی کنواری زندگی نچھاور کر دی ہے۔

اس دلیر اور باوقار دوشیزہ کے محبوب کا نام ہے۔

"آزاد ویت نام"۔

اس لڑکی کی تصویر کے نیچے لکھا ہے کہ اس نے اس مشین گن سے اپنے محبوب یعنی آزاد ویت نام کو بچانے کے لئے اس کے کئی مخالفوں کو سائیگاں کی سڑک پر ہمیشہ کی نیند سلا دیا ہے۔

اس لڑکی کا مقابلہ ان لمبے تڑنگے جوانوں سے تھا۔ جن کے جسم پر گولیوں کو روکنے والی آہنی اور گرم وردیاں تھیں۔ جن کے ہاتھوں میں نہایت قیمتی جدید اور مہلک ہتھیار تھے۔ جن کے پاس کئی کئی دن کے لئے نہایت لذیذ خوراک بھی موجود تھی!۔

لیکن اس لڑکی کے چہرے کے پاس پانی کا ایک تھرماس پڑا تھا جو بالکل خالی تھا اور کاغذ کی ایک چھوٹی سی تھیلی میں ڈبل روٹی کا صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا پڑا تھا۔

لیکن وہ لڑکی کھانے پینے تو سائیگاؤں نہیں آئی تھی۔ وہ باوفا عشق پیشہ لڑکی تو اپنے محبوب کے لئے جان دینے سائیگاؤں پہنچی تھی۔

اس نے اپنے محبوب "ویت نام کے لئے" زندگی دے دی ہے۔ اور اس کی زندگی اب ویت نام کو مل گئی ہے۔

یہ لڑکی صرف ایک نوعمر کنواری لڑکی نہیں ہے۔ بلکہ یہ لڑکی بہادر ہے، یہ لڑکی کی شجاعت ہے یہ لڑکی دلیری ہے۔

یہ لڑکی تو ختم ہو چکی۔ لیکن بہادری اس لڑکی پر ختم نہیں ہوئی۔

یہ لڑکی کروڑوں ویت نامی لڑکیوں میں سے صرف ایک ہی لڑکی ہے۔

میں اس نوعمر لڑکی کی لاش کو سلام کرتا ہوں اس لئے کہ میں ویت نامی عوام کی بہادری کو سلام کرنا چاہتا ہوں

یہ دوسری لاش جو سائیگاؤں کے فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی ہے، ایک جنوبی ویت نامی پولیس کانسٹیبل کی لاش ہے۔ اس کے جسم پر بھرپور وردی ہے، اس کے ہاتھ میں بھی ایک مشین گن ہے، اس کے پیروں میں مضبوط جوتے ہیں، سر پر لوہے کا خود ہے۔ اس کے جسم سے پانی کی بھری بوتل لگی ہے، اس کے بیگ میں کھانے پینے کا سامان بھرا ہوا ہے، اس کی جیب میں روپیہ بھی ہے۔

اب یہ اسی سڑک پر جس سڑک پر وہ اپنے ویت نامی بھائیوں کو گرفتار کرتا۔ ان کے چالان کرتا۔ انہیں ڈانٹتا ڈپٹتا گالیاں بکتا اور مارتا پیٹتا تھا۔ بے یار و مددگار پڑا ہوا ہے۔

تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ سائیگان کے باشندے اس لاش کے قریب سے پیدل۔ سائیکلوں پر اور اسکوٹروں پر گزرے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن کوئی شخص بھی اس لاش کو ہٹا کر ایک

طرف نہیں کرتا۔ اس لاکش کو دیکھنے کے لئے راہگیر لمحہ دو لمحے کے لئے ٹھیر تو جاتے ہیں لیکن کسی آنکھ میں اس لاش کے لئے آنسو تو کجا۔ غم کی ہلکی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی۔

اس بدنصیب شخص نے چند سکوں والی تنخواہ کے لئے اپنے حاکموں کی طرف سے اپنے ہی ہم وطن بھائی بہنوں کے سینے پر مشین گن تان دی تھی۔

اُس لڑکی نے تو اپنے محبوب "ویت نام" کے لئے جان دی تھی۔

اس بدنصیب نے صرف چند سکوں اور چند روٹیوں کے لئے جان دیدی۔

یہی وجہ ہے کہ اُس لڑکی کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آتے ہیں، اور بدنصیب کانسٹیبل کو دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔

یہ تیسری لاکش ایک نوجوان امریکی سپاہی کی ہے۔ یہ لاکش دریائے خوشبو Perfume River کے کنارے پر بے گور و کفن پڑی ہے۔ اس نوجوان امریکی سپاہی کی عمر چوبیس پچیس سے زیادہ نہ ہوگی۔ یہ پتہ نہیں کہ امریکہ کے کس شہر یا کس گاؤں کا رہنے والا تھا بیچارا۔؟ یہ کہاں پیدا ہوا۔؟ اور کہاں آکر مرا بیچارا۔؟

ویت نام اس کے پیارے وطن کا کوئی مقدس ٹکڑا تو نہ تھا کہ کوئی اس کی لاکش پر پھول رکھ دے کہ اس نے پیارے وطن پر سے اپنی جان نچھاور کر دی۔

یہ نوجوان اپنے وطن، اپنے ماں باپ، اپنے بھائی بہنوں، اپنی بیوی بچوں یا اپنی منگیتر یا محبوبہ سے ہزاروں میل چیلوں، گدھوں، کوّوں، گیدڑوں اور لومڑیوں کا ناشتہ بنا پڑا ہے، اس کی لاکش ایک سوالیہ نشان کی طرح دُہری ہوئی پڑی ہے اور سوال یہ ہے کہ

"اس نے کیوں جان دی۔ ؟ یہ کیوں مرا ؟"

"وطن کے لئے یا تنخواہ کے لئے۔ ؟"

"کسی عقیدے کے لئے یا صرف اپنے آقاؤں کے حکم پر۔ ؟"

"امن عالم کے لئے یا اپنے آقاؤں کی ضد یا جھوٹے وقار کے لئے۔ ؟"

اب امریکہ کے کسی ہوائی اڈے کے برآمدے میں کوئی ماں جیسی بوڑھی عورت اور کوئی بیوی یا محبوبہ جیسی دوشیزہ ویت نام سے آنے والے ہر جہاز کے دروازے سے اُترنے والے ہر فوجی کو غور سے دیکھے گی۔

لیکن وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔

۲۲ فروری ۱۹۶۸ء

کالے شہیدؔ

(رھوڈیشیا میں)

ظلم کی تلوار سے سچ کی گردن تو کاٹی جاسکتی ہے اور پھانسی کے پھندے سے سچ کا گلا بھی گھونٹا جاسکتا ہے، لیکن اُس گلے سے نکلنے والی سچ کی آواز کو ظلم کی تلوار قتل کرسکتی ہے اور نہ پھانسی کا پھندہ اُس کلمۃ الحق کو ہلاک کرسکتا ہے۔

جسم فانی ہے۔ اسم ابدی ہے
حق کا سپاہی مرجاتا ہے
لیکن۔ حق امر ہوجاتا ہے۔

اس وقت میری نظریں ہزاروں میل لمبی ہوگئی ہیں۔

دُور۔ ہزاروں میل دُور۔ کالے براعظم افریقہ کے جنوب میں، آبشارِ وکٹوریہ

کے دامن میں پھیلے ہوئے ظلم کے نگر۔ رہوڈیشیا کے سب سے بڑے شہر سالسبری کے زندان کے مقتل میں پھانسی کے پانچ پھندوں سے افریقی حرّیت پسندوں کی پانچ لاشیں لٹک رہی ہیں۔

اور میری نظریں آزادی اور سچائی پر سے جان نثارانِ پانچوں شہیدوں کی لاشوں کو بڑی عقیدت سے اور بڑے احترام سے چوم رہی ہیں۔

کیونکہ انہی پانچ شہیدوں کی حیاتِ جاوداں کا آغاز، دراصل افریقہ میں سفید فام سامراج کی موت کا آغاز بھی ہے۔

رہوڈیشیا کی آبادی ۴۲ لاکھ ہے جس میں سے صرف ۲ لاکھ سفید فام غیر افریقی باشندے اپنے ظالم وسفاک وزیر اعظم اسمتھ کی سرکردگی میں ۴۰ لاکھ سیاہ فام افریقی باشندوں کو ان کے اپنے ہی گھر میں غلام بناتے ہوئے ہیں۔

برطانیہ کی ماتحت مملکت رہوڈیشیا میں دو سال پہلے جلاد اسمتھ نے برطانیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے اپنی "غیر قانونی اور غیر مہذب" حکومت قائم کی تھی۔

حکومت برطانیہ گزشتہ دو سال سے اس غیر قانونی حکومت کو معزول کرنے کی (بظاہر) کوشش کر رہی ہے۔ لیکن منظر دراصل یہ ہے کہ سفید فام برطانیہ نے دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے اسمتھ کی ٹانگ تو پکڑ رکھی ہے اور سرگوشیانہ لہجے میں اسمتھ سے کہہ رہا ہے۔

"ڈٹ کے کھڑا رہیو برخوردار — ! اطمینان رکھ۔ میں تیری ٹانگ نہیں کھینچوں گا۔"

ورنہ اسمتھ اور اس کے چند ہزار حواریوں کی کیا مجال کہ وہ برطانیہ، امریکہ پاپائے روم، اتحادی انجمن اور ساری دنیا کی رائے عامہ کو یوں دیدہ دلیری اور سینہ زوری سے ٹھکرا سکے۔

صرف برطانیہ اکیلے کے سامنے اسمتھ حکومت ایک چیونٹی سے زیادہ نہیں ہے۔

دنیا کا کوئی ملک اسمتھ حکومت کو تسلیم نہیں کرتا۔

پاکستان نے علی الاعلان اسمتھ حکومت پر لعنت بھیجی ہے۔

امریکی حکومت نے اسمتھ کو امریکہ کا ویزا دینے سے انکار کر دیا۔

اسمتھ، امریکہ اور دُنیا کے کسی بھی مہذب ملک کا سفر نہیں کر سکتا۔

لیکن اسمتھ کو کسی کی کوئی پرواہ نہیں۔

ملکہ الزبتھ نے ان پانچوں افریقی شہیدوں کی سزائے موت معاف کر دی لیکن اسمتھ نے ملکہ الزبتھ کے فرمان کو بھی پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔

دُنیا بھر کے عیسائیوں کے پیشوائے اعظم پاپائے روم نے اسمتھ سے دردمندانہ اپیل کی کہ وہ ان افریقی حریت پسند کو سزائے موت نہ دے لیکن اسمتھ نے جیسے جواب دیا۔

اسمتھ خراب حال کو پاپا نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اب اتحادی انجمن کی سلامتی کونسل بھی اسمتھ کے خلاف "صرف" غور کر رہی ہے۔

ساری دُنیا کی رائے عامہ ملک ملک اور شہر شہر میں اسمتھ کے ظلم کے خلاف

گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی ہے لیکن سفید فام آقائیت کا علمبردار اسمتھ ظلم کے منھ زور گھوڑے پر سوار سارے رہوڈیشیا میں علی الاعلان افریقی حریت پسندوں کو انہی کے اپنے گھر میں روندتا کچلتا پھر رہا ہے۔

ظالم کے بھی کتنے عیش ہوتے ہیں!!

مرنے کے بعد وہ دوزخ میں جلے یا دنیا کی تاریخ میں اس کا نام نفرت کی روشنائی سے لکھا جائے۔ یا پھر اس کی قبر پر کتے لوٹیں یا انسان تھوکیں۔ ظالم تو زندگی میں عیش کر جاتا ہے پٹھا۔!

اس کی زندگی میں یہ ساری دُنیا اس کی قدموں میں بلکہ اس کی ٹھوکروں میں ہوتی ہے۔

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اسے کیا پرواہ۔!

ظلم تو اس کے کان میں ہر دم یہی بات پھونکتا رہتا ہے۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

لیکن انسان صرف اپنی زندگی تک کے لئے ہی زندہ رہنے اس دنیا میں نہیں آیا ہے'

زندگی جسم کم اور اسم زیادہ ہے۔

اسی لئے میں ماضی کے اسلحہ خانے میں جھانک رہا ہوں اور ان سارے ہتھیاروں کو دیکھ رہا ہوں جو اس دُنیا سے "سچائی" کو مٹانے کے لئے استعمال کئے جاتے رہے۔

یہی وہ زہر کا پیالہ ہے جو سقراط کو پلایا گیا تھا۔

یہی وہ پھانسی کا پھندا ہے جس نے منصور کا گلا تو گھونٹ دیا لیکن اس گلے سے

گونجنے والے نعرۂ حق کو نہ گھونٹ سکا۔

یہی وہ صلیب ہے جس سے عیسٰیؑ مصلوب کئے گئے۔

اور یہی وہ تلوار ہے جس سے حسینؑ شہید کئے گئے۔

یہ ہتھیار تو اب ماضی کے اسلحہ خانے میں نظروں سے اوجھل ہیں البتہ سقراط، منصورؒ، عیسٰیؑ اور حسینؑ آج بھی زندہ ہیں، اور ابدالآباد تک زندہ رہیں گے۔

سقراط کے زہر کے پیالے سے لے کر زندان ساتسبری کے پھانسی کے پھندوں تک کتنے زہر کے پیالے، ظلم کے کتنے خون آلود ہتھیار اور پھانسی کے کتنے قاتل پھندے ہیں لیکن ......

لیکن سچ بھی کتنا سخت جان ہوتا ہے۔!

سچ بھی گویا خضر علیہ السلام ہے یارو!

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے شہداء

انگریز سامراج کے سینے میں ہمالہ کے بیٹے کی پہلی گولی اب سے ٹھیک ۱۱۲ سال پہلے آج ہی کے یادگار، مقدس اور جگمگاتے دن یعنی ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کے لہو پیرہن دن میرٹھ شہر کی فوجی چھاؤنی میں ارض ہمالہ کے ایک غیرت مند حریت پسند گم نام جیالے بیٹے نے انگریزی اقتدار کے سینے پر آزادی کی پہلی گولی چلائی تھی۔

اس پہلی گولی کا زہر آہستہ آہستہ انگریز سامراج کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں پھیلتا چلا گیا اور بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ٹھیک نصف شب کے وقت انگریز سامراج ارض ہمالہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُٹھ گیا۔

میرٹھ شہر پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنے سے پہلے آؤ یادو ہندوستان کے پہلے

دروازے کالی کٹ کی بندرگاہ تک چلیں۔

منظر کو سمجھنے کے لئے پس منظر کو دیکھنا چاہیئے۔

جب تک دل میں نفرت پوری طرح نہیں کھولتی۔ اس وقت تک بندوق کی لبلبی بھی انگلیوں کی زد میں نہیں آتی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کا آغاز۔

سراج الدولہ کے لہو۔ ٹیپو کی تلوار اور میرٹھ کے گمنام سپاہی کی پہلی گولی سے ہوتا ہے یہ سچ بھی ہے۔ تاریخ بھی یہی ہے۔

لیکن میرا خیال ہے کہ جس دن کالی کٹ کی بندرگاہ میں پہلے غیر ہندوستانی ایک پرتگالی ملاح سیاح واسکوڈی گاما پر ہندوستان کا پہلا دروازہ کھلا۔ ٹھیک اسی دن سے غیر ارادی غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر غیر ملکیوں کے خلاف نفرت کی آنچ بھی اٹھی۔ جبھی تو کالی کٹ کی بندرگاہ کے دروازے سے جو راستہ شروع ہوا وہ میرٹھ کی فوجی بارک کے پھاٹک پر ختم ہوا۔

اُس وقت بھلا کون جانتا تھا کہ واسکوڈی گاما نے صرف ہندوستان کا سمندری راستہ ہی نہیں کھولا ہے۔ بلکہ ہندوستانیوں کے لئے —— ان کے اپنے ہی گھر میں غلامی اور قید کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔

واسکوڈی گاما کا جہاز ہندوستان کے ساحل پر کیا لنگر انداز ہوا کہ ہندوستان دُنیا بھر کی قوموں کے سامنے بے نقاب ہوگیا۔

وہ ہندوستان جس کے حسن، اور دولت کے قصّے ساری دُنیا کے انسانوں کی زبانوں پر تھے اور وہ ہندوستان جو کولمبس سے لے کر واسکوڈی گاما تک ہر سیاح اور ہر ملاح کی ہر رات کا سُہانا خواب تھا۔!

واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا بحری راستہ کیا دریافت کیا کہ پھر جیسے دُنیا بھر کے جہاز جیسے مقناطیسی کشش کے ذریعے ہندوستان کی طرف کھنچنے لگے۔ سمندر کشتیوں کے بادبانوں سے چھپ گیا۔

انہی دنوں انگریزا اور پرتگالی ملاحوں کی ایک بحری جنگ میں انگریزوں نے پرتگالیوں کا ایک وہ جہاز پکڑ لیا۔ جو ہندوستان کے سونے، ریشم، قالینوں، موتیوں، ہیروں، جواہرات گرم مصالحوں، جڑی بوٹی کی داؤں اور خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا۔

اُس جہاز کا سارے انگلستان میں چرچا ہو گیا۔ اُڑتی اُڑتی بات قصر بکنگھم میں ملکہ الزبتھ اوّل تک جا پہنچی اور ملکہ الزبتھ کے منہ سے بھی رال ٹپک پڑی۔

اس رال کو تاریخ کی زبان میں "ایسٹ انڈیا کمپنی" بھی کہتے ہیں، پھر انگریز شہنشاہ اکبر اعظم کے زمانے میں ہاتھ میں صرف "ترازو" لے کر ہندوستان میں داخل ہوا۔ اور اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد اس کے دائیں ہاتھ میں تلوار تھی، اور بائیں ہاتھ ہاتھ میں ترازو۔ جیسے ہی ہاتھ میں ترازو کے ساتھ تلوار بھی آگئی تو دور اندیشوں نے اسی وقت نشان دہی کر دی کہ

ع دیکھ لو تاجر کے سر پہ تاج ہے

دہلی میں وہ برائے نام شہنشاہ ہند بیٹھا تھا جس کے بارے میں یار لوگ یوں قافیہ

ملاتے تھے۔

"سلطنت شاہ عالم۔ از دہلی تا پالم"۔

لیکن ہمالہ کے سبھی بیٹے تو ایسے مہمان نواز نہ تھے کہ وہ مہمان کی غلامی کو معراج میزبانی سمجھیں۔

ہمالہ کی زمین نے نواب علی وردی خاں، سراج الدولہ، ٹیپو شہید، نند کمار، نجیب الدولہ فیروز شاہ، تانتیا ٹوپی، عظیم اللہ خان، نانا صاحب پیشوا۔ احمد اللہ شاہ مدراسی اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی جیسی غیرت مند اولاد بھی اسی کوکھ سے جنم دی تھی۔

سراج الدولہ کے لہو کا داغ، ٹیپو کی کوندتی تلوار، اور رانی جھانسی کی مانگ کا سیندور ان سب میں غلامی سے آزادی کی تڑپ کی بڑی چمک تھی۔

ہندوستان کی فضاؤں میں دھیرے دھیرے آزادی کی تڑپ کے نغمے گونجنے لگے تھے۔ احمد اللہ شاہ مدراسی کا ترانہ چوری چھپے سینہ بہ سینہ گونج رہا تھا کہ

ع فرنگی ظالموں سے ہند کو اب پاک کرنا ہے۔

ادھر جھانسی کی رانی لکشمی بائی گھوڑے پر سوار شمشیر بکف انگریزوں کی طرف بڑھی تو سارا ہندوستان خوشی سے گانے لگا۔

ے تالوں میں تال بھوپال تال باقی سب تلیاں

رانیوں میں رانی جھانسی باقی سب گدھیاں

پُراسرار چپاتیاں اور سور کے گوشت کے کارتوس تو محض دکھاوا تھے گویا نفرت

کے لاڈے کے لئے ایک مُنہ، ایک بہانہ۔۔ ۱۰ مئی، ۱۸۵۷ء کے دن میرٹھ میں ہمالہ کے ایک گمنام جیالے بیٹے نے ایک انگریز افسر کے سینے کو تاک کر جو پہلی گولی چلائی وہ گولی صرف اُس ایک انگریز افسر کا سینہ نہیں بلکہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا جگر چیر کر نکل گئی۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو اس گولی نے نہ صرف انگریزی اقتدار کا جگر چیر دیا بلکہ دُور مستقبل میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بابِ آزادی کے قفل کو بھی توڑ دیا۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کے دن سے شروع ہونے والی جنگِ آزادی بظاہر تو شکست پر ختم ہوئی لیکن وہ شکست بھی گویا فتح کا پہلا دروازہ تھی۔

کسی بھی غلام قوم کی آزادی کا چراغ اس کے محبِ وطن سرفروش بیٹوں کے لہو سے جلتا ہے۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک جن بے شمار جیالوں نے اپنے لہو کے چراغ جلائے وہی چراغاں تو پاکستان ہے۔! وہی چراغاں تو آزاد ہندوستان ہے۔!!

۱۰ مئی ۱۹۵۷ء کا بہت بڑا دن۔

جب تک ۱۰ مئی کا سورج ہماری یادداشت کے اُفق سے طلوع ہوتا رہے گا دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں دوبارہ غلام نہیں بنا سکتی۔

اسی لئے میں ۱۰ مئی کے سورج کو سلام کرتا ہوں۔

ننھا شہیدؒ
(ایاز جاوید)

اگر ہمارے معاشرے میں چوراہوں پر مجسمے نصب کرنے کی اجازت ہوتی تو میں مشن روڈ کراچی کے چوراہے پر ننھے شہید ایاز جاوید کا مجسمہ نصب کروا دیتا تاکہ دُنیا دیکھے کہ ہماری قوم میں بھی ایسے صالح اور غیرت مند نوجوان موجود ہیں جو عورت کی آبرو کے لئے بھی اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔

میں اس ننھے شہید ایاز جاوید کو بالکل نہیں جانتا ———— پہلی بار اس کی پہلی اور آخری تصویر اخبار میں دیکھی تھی۔ اور اس کے بارے میں یہ المناک خبر پڑھی ہے کہ وہ گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول کوتوال بلڈنگ میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس نے زندگی کی صرف سولہ بہاریں دیکھی تھیں۔

اس نے اپنے چند ساتھی طالب علموں کو دیکھا کہ وہ ایک راہ چلتی طالبہ کو چھیڑ رہے ہیں تو پاک قوم کے اس نوعمر بیٹے ایاز جاوید کے جسم میں ایک غیرت مند بھائی جاگ پڑا۔ اور وہ اس اجنبی لڑکی کی حرمت کے سامنے ایسے ہی سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے وہ اجنبی لڑکی اس کی اپنی سگی بہن ہو۔

وہ اس لئے سینہ سپر ہو گیا کہ غنڈہ گردی کا گندہ ہاتھ پاک قوم کی پاک بیٹی کی آبرو کے گریبان تک نہ پہنچ سکے۔

وہ گندہ ہاتھ قوم کی بیٹی کی آبرو کے گریبان تک تو نہ پہنچ سکا۔ البتہ اس ظالم ہاتھ کے جگر تراش چاقو نے اس سینے کو چیر ڈالا جو پاک نسوانیت کی حرمت کے آگے سپر ہو گیا تھا۔

اسی خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کراچی کے ایک بڑے سرکاری ہسپتال کے بڑے دروازے کے عین سامنے نوعمر بہادر ایاز جاوید پر مہلک قاتلانہ حملہ کیا گیا۔

اس اندوہ ناک مقام واردات پر موجود لوگوں کا بیان ہے کہ ایاز جاوید کو بروقت طبی امداد مل جاتی تو شاید اس غیرت مند نوجوان کی قیمتی زندگی پاکستان کے مستقبل کی درخشندگی کے لئے بچ جاتی۔

حیرت ہے کہ کراچی کے بہت بڑے سرکاری ہسپتال کے عین دروازے پر ایک جاں طلب انسان کو بروقت طبی امداد نہ مل سکی!؟

اس المیے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ جب مقتول کے بھائی۔ دیگر طلبہ اور راہگیروں نے

زخمی ایاز جاوید کو اسپتال کے اندر لے جانا چاہا تو چوکیدار نے انہیں منع کر دیا اور ہدایت کی کہ اسے "شعبۂ حادثات" والے دروازے سے اندر لایا جائے۔ شعبۂ حادثات والا دروازہ دوسری طرف اور کافی دور تھا اور جہاں تک پہنچنے کے لئے تقریباً پندرہ بیس منٹ درکار تھے جبکہ جاں بلب انسان کی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔

اگر اس جاں بہ لب نوجوان کو اس "ممنوعہ دروازے" سے اندر لے جایا جاتا تو صرف چند منٹوں میں اسے طبی امداد مل جاتی اور قوم کے اس "سرمایہ نوجوان" کی زندگی محفوظ کی جا سکتی تھی۔

لیکن وہ حکم کا غلام چوکیدار بھی کیا کرے۔!! حکم حاکم مرگِ مفاجات' چوکیدار کو ایاز جاوید کی مرگِ مفاجات سے کیا مطلب! وہ تو حکم حاکم کو ایاز جاوید کی مرگِ مفاجات پر بہرحال ترجیح دے گا۔

اگر یہ بات صحیح ہے کہ جاں بہ لب ایاز کو اسپتال کے بڑے دروازے سے اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی تو پھر یہ کہنا بھی حق بجانب ہے کہ :۔

ایاز پہلے تو غنڈہ گردی کے ہاتھوں جاں بہ لب ہوا۔ اور پھر
زکر شاہی کے سنگدلانہ حکم نے اسے ہلاک کر دیا۔

مذاہب اور قوانین کے احکام تو یہ ہیں کہ :۔

"بدی کو سنگسار کر دو"

لیکن از ہابیل تا ایاز جاوید۔ بدی کے خلاف سینہ سپر نیکی ہی سنگسار اور

ہلاک ہوتی رہی ہے۔

انسان کی تاریخ کا ہر صفحہ بدی کے خلاف نیک انسان کے لہو سے لکھا گیا ہے، دنیا کا ہر سورج گواہ ہے کہ جس نے بھی بدی کے سامنے سینہ سپر کیا وہ زیادہ دیر تک اس زمین پر کھڑا نہ ہو سکا۔

نیک آدمی کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔

لیکن نیک آدمی مرتا بھی نہیں ہے وہ شہید ہو جاتا ہے اور شہید تو زندہ جاوید ہوتا ہے۔

نوعمر ایاز جاوید بھی تو زندہ جاوید ہو گیا۔ "ایازیت" ویسے بھی جاوداں ہوتی ہے "ایازیت" جذبۂ وفا کا ایک نہایت پیارا اور نہایت مانوس نام ہے۔

ایک بہن کی آبرو کے لئے اپنی جان پر کھیل کر زندگی ہی میں جاوید — ایاز مر کر بھی زندہ جاوید ہو گیا۔

ایاز نے اس قوم کے غیرت مند جوانوں کی لاج رکھ لی ہے۔

ہمارے معاشرے میں ان بدروح ذہنی مریض نوجوانوں بلکہ نامردوں کی بھی بہتات ہے جو درس گاہوں، بس اسٹاپس، بازاروں، گلی کوچوں، قومی اور مذہبی تہواروں اور چراغاں کی راتوں میں پاک عورت کی آبرو پر اپنی رذالت کی گندگی اُچھالتے پھرتے ہیں۔

لیکن ہمارے معاشرے میں ایاز جاوید جیسے "مرد" جوانوں کی بھی کمی نہیں جو قوم کی ماں، بہن یا بیٹی کی حرمت کے تحفظ کے لئے اپنے لہو کا آخری قطرہ تک بہا دیتے ہیں، جو غنڈہ گردی کے عفریت کا سر کچلنے کے لئے اپنے سر تک کی پرواہ نہیں کرتے۔

ایاز جاوید کا لہو کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ اس کے لہو سے پاکستان کے صالح غیرت مند اور مثالی نوجوان کی حیاتِ جاوداں کا چراغ جل اُٹھا ہے۔

اب اس چراغ کی روشنی میں کسی غنڈے کا ہاتھ پاک عورت کی مقدس آبرو تک پہنچنے سے پہلے ہی قلم کر دیا جائے گا۔

میں ایاز جاوید کے ماں باپ کو بھی بالکل نہیں جانتا لیکن اب میں بڑے فخر سے پاکستان کے ہر باپ اور ہر ماں سے یہی کہوں گا کہ :-

"جنم دینا ہے تو ایسے ہی غیرت مند بیٹے جنم دو"

"جنو تو ایسے شیر بیٹے جنو"

اس قوم کا مستقبل صرف غیرت مند نوجوانوں کے آفتاب ماہتاب چہروں سے چمک دمک سکتا ہے۔

جیسا کہ ایاز جاوید کا لہو رنگ چہرہ !!

موت یا قتل

(غریب حجام ادریس)

بعض انسان عالمگیر ہوتے ہیں۔

وہ جب تک اس دُنیا میں زندہ رہتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ساری دنیا انہی کے وجود سے زندہ ہے۔ وہ ختم ہو جائیں گے۔ تو دُنیا بھی ختم ہو جائے گی

لیکن دُنیا بڑی سخت جان ہے۔

خدائی کا دعویٰ کرنے والے بادشاہ نمرود سے لے کر سکندر، ہلاکو، چنگیز، جولیس سیزر نپولین اور ہٹلر تک کتنے فاتحین عالم اس دُنیا میں آئے جنھوں نے دُنیا کے وجود کو اپنے وجود سے وابستہ کر دیا تھا جیسے وہ ہیں تو دُنیا بھی ہے۔

لیکن ہر روز دُنیا کا تماشہ دیکھنے والے سورج نے دیکھا ہے اور وہ گواہ ہے کہ بڑے

سے بڑا عالمگیر انسان مر گیا۔ اب بھی دُنیا ایک لمحے کے لئے بھی نہ رُکی۔ بلکہ دُنیا تو ایسی رواں دواں ہے کہ بڑی سی بڑی عالمگیر شخصیت کو اس کی قبر تک کندھا دینے کے لئے بھی اس کے قدم نہیں رُکتے۔

میں جب بھی کسی بہت بڑے انسان کے بڑے مقبرے کے اِردگِرد سڑکوں پر زندگی کو بسوں، کاروں، ٹراموں، رکشاؤں، سائیکلوں اور اسکوٹروں پر تیز تیز رواں دواں دیکھتا ہوں تو ایک لمحے کے لئے یہ بات مجھے ضرور یاد آ جاتی ہے کہ

زندگی بڑے سے بڑے مقبرے پر بھی ختم نہیں ہوتی۔

جب دُنیا کسی جہاں گیر شخصیت کے لئے بھی، ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رُکتی۔ ٹھہرتی تو غریب ادریس کے لئے کیسے رُک سکتی تھی!

ادریس ایک غریب حجام تھا۔

وہ "اچھی زندگی" کے لالچ میں پاکستان سے باہر چلا گیا اور اپنے گھر سے سینکڑوں میل دُور خلیج فارس کے ساحل پر ایک "بُری موت" کے آغوش میں دُنیا سے ہمیشہ کے لئے اُوجھل ہو گیا۔

اپنے گھر، اپنے پیاروں سے دُور بے یار و مددگار یکہ و تنہا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینا اور ایسی موت مرنا کہ نہ جنازہ اُٹھے نہ قبر بنے۔ یقیناً ایک بُری موت ہے۔

اور سب سے زیادہ دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ ادریس نے یہ بُری موت تین سو روپے میں خریدی تھی۔!

یار لوگوں نے ادریس کو بھی بہکار کھا تھا کہ وہاں خلیج فارس کے ملکوں دوبئی، بحرین، قطر وغیرہ میں یہاں سے بہتر زندگی ہے، وہ اس بہتر زندگی کے لئے مہینوں سے سگریٹ بیڑی اور سنیما اور میلے ٹھیلے چھوڑ کر پیسہ پیسہ جوڑ رہا تھا تاکہ تین سو روپیہ جمع ہو جائے۔ تین سو روپیہ وہ رقم ہے جو ناجائز اور چوری چھپے لانچ چلانے والے ہر اس مسافر سے وصول کرتے ہیں، جو بغیر پاسپورٹ پاکستان سے باہر جاتا ہے۔

بظاہر تو وہ "اچھی زندگی" کے لئے تین سو روپیہ جمع کر رہا تھا لیکن اصل میں وہ "بُری موت" کے دام جوڑ رہا تھا۔

اچھی زندگی بھی بھلا تین سو روپے میں مل سکتی ہے!

میں صرف دو بار برس سے اپنے بال کٹواتا ہوں، صلاح الدین یا جمیل۔ لیکن پچھلے مہینے نہ تو صلاح الدین موجود تھا اور نہ جمیل۔ ادریس البتہ بڑی عاجزی سے کہہ رہا تھا۔

"بابو جی۔ آخری بار تو مجھ سے بال کٹوا لو اور میرا نام اخبار میں چھپوا دو"

میں نے اس سے کہا۔

"غریب آدمی کا نام اخبار میں اس وقت تک نہیں چھپتا جب تک کہ وہ کسی حادثہ کی موت نہ مرے!"

اور ادریس نے بڑے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"بابو جی۔ میں کل دوبئی جا رہا ہوں، لانچ کے کرائے کے لئے"

تین سو روپیہ جمع کرلیا ہے۔"

میں نے اسے منع کیا کہ اپنے وطن میں جو کچھ روکھی سوکھی مل جاتی ہے۔ وہ پردیس کے حلوے مانڈے سے بہتر ہے۔ تو وہ شاعری پر اُتر آیا۔

ابی وہ ساعر نے کیا سعر کہا ہے

سر پھول وہ چڑھا جو چمن سے نکل گیا
اجّت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

بابو جی۔" اپنے وطن میں تو نبی کو بھی اجّت نہیں ملی۔ میں تو معمولی باربر ہوں"

میں نے اس وقت ادریس کی اس بات کا اس لئے کوئی جواب نہیں دیا کہ میں ایک اور سوچ میں مبتلا ہوگیا۔

آخر یہ کیا بات ہے۔ غریب ہو یا امیر اَن پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ سب ہی اپنے وطن سے باہر جانے کے لئے پَر تول رہے ہیں۔؟

کیا یہاں زندگی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے ؟

کیا واقعی یہ حقیقت ہے کہ

؎ عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا۔!؟

اپنا تجربہ تو اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں نے تقریباً ساری دُنیا دیکھ ڈالی ہے لیکن

جو مزہ چھجو کے چوبارے
وہ مزا بلخ نہ بُخارے

اب کل شام میں پھر بال کٹوانے مقبول ہیئر ڈریسرز گیا تو میں نے دیکھا مقبول صاحب صلاح الدین اور جمیل کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا خیریت تو ہے؟ تو مقبول صاحب نے بتایا۔

"دوبئی سے ایک خط آیا ہے کہ بیچارا ادریس اور اس کے ساتھ ستّر ساتھی مر گئے۔"

تفصیل یہ بتائی گئی کہ کراچی سے دوبئی چوری چھپے جو لانچ انسانوں کو اسمگلنگ کرتی ہے وہ چھ سات دن میں پہنچتی ہے، اس میں کھانے پینے کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا اور کسی غیر آباد ساحل پر ان بدقسمت انسانوں کو اتارا جاتا ہے تاکہ اُن ممالک کی پولیس لانچ کو نہ پکڑ سکے۔

ادریس بھی رات کے اندھیرے میں ایک غیر آباد ساحل پر اُتارا گیا۔ ہفتے بھر کے بھوکے پیاسے ادریس اور اس کے ساتھی اپنے گھر اور اپنے پیاروں سے بہت دُور اس ساحل پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔

ادریس کی بیوہ بھی مر گئی ہے۔ وہ جیتے جی مر گئی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بیوہ ایک "زندہ مردہ" ہی تو ہوتی ہے۔

چند لمحوں کے بعد صلاح الدین میرے بال کاٹنے لگا۔ اب وہ ادریس کو بھول کر چینی کی مہنگائی۔ جیکولین کینیڈی کی شادی اور فلمی اداکاروں کے رومان پر باتیں کرنے لگا۔ لیکن میری نظریں خلیج فارس کے ساحل تک لمبی ہو گئی تھیں اور

غریب الوطن ادریس کی بے گور و کفن لاش کو ٹٹول رہی تھیں کہ

یہ موت ہے۔ یا۔ قتل ؟

ایسے کتنے ادریس خلیج فارس کے ساحل پر اُترنے کے بجائے موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں !

لیکن ہم کس کا گریبان پکڑیں۔ ؟ ؟ ؟

۶ر نومبر ۱۹۶۸ء

آگ

آگ تو چراغ جلاتی ہے۔
لیکن یہ کیسی آگ تھی جو اتنی بہت سے زندگیوں کے چراغ بُجھا گئی۔ !
آج ملک کے اخبارات غریب آباد کے مظلوم شہیدوں کی لاشیں اُٹھائے۔ ہر پاکستانی باشندے کو دکھاتے پھر رہے ہیں کہ
"بتاؤ۔ ان کا قاتل کون ہے۔ ؟
یہ آگ کوئی نئی یا کوئی چونکا دینے والی آگ نہیں تھی۔ یہ آگ تو پچھلے پندرہ سال سے لگی بھڑکتی چلی آرہی ہے
پاکستان کے جھونپڑیوں کی آگ "تراب نمرود کی آگ" کی طرح شہرت حاصل

کر گئی ہے۔

نمرود کی آگ تو صرف ایک بار جلی اور بجھ گئی۔ نمرود کی آگ تو گلزار بھی بن گئی تھی۔
لیکن کراچی کی جھونپڑیوں کی آگ۔ یہ تو بجھنے کے لئے جلتی ہے اور جلنے کے لئے بجھتی ہے
اور یہ اس وقت تک جلتی بجھتی رہے گی جب تک پاکستان میں غریب آدمی رہیں گے۔
پاکستان کے جسم پر جھونپڑیوں کے پھوڑے بھی ابھرتے رہیں گے۔

آگ کی غذا جھونپڑی۔

جب تک اس پاک سرزمین پر ایک بھی غریب آدمی زندہ ہے۔ اس وقت تک
یہ آگ بھڑکتی ہی رہے گی۔

جب اس پاک سرزمین سے سارے غریب مٹ جائیں گے تو پھر یہ آگ بھی
ہمیشہ کے لئے بجھ جائے گی۔

آگ اسی لئے لگتی ہے کہ غریب۔ آباد نہ رہ سکیں تو پھر یہ غریب آباد کے عجیب
غریب لوگ یہ لاشے کیوں اٹھائے پھر رہے ہیں۔!

اس سے پہلے کتنی آگیں لگ چکی ہیں، اور پچھلے پندرہ سال میں کتنی سینکڑوں
لاشیں ہم دیکھ چکے ہیں، اب کسی لاش کا کوئی اثر نہیں، اب لاشوں کو دیکھ کر ایک آنسو بھی
آنکھ میں نہیں آتا۔

اور آنسو بھلا کسی آگ کو بجھا سکتے ہیں ؟

آگ بجھانے والوں نے آگ بجھا دی۔ اور اس لئے بجھا دی کہ ان کے پاس آگ

بجھانے والے انجن موجود ہیں۔
لیکن ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے زمین پر جھونپڑی کھڑی ہو اور نہ جھونپڑی میں آگ لگے۔
ان کے پاس ایسا کوئی انجن نہیں جو کسی کی زندگی میں آگ لگنے ہی نہ دے۔
ان کے پاس تو صرف ایسے انجن ہیں جو آگ کو صرف بجھا سکتے ہیں۔
اور انہوں نے آگ بجھا دی ہے۔
غریب آباد کی آگ تو بجھ چکی ہے۔
آگ بجھ بھی چکی ہے۔
آگ بھڑک بھی اٹھی ہے۔
سب یہی دیکھ رہے ہیں کہ غریب آباد کی جھونپڑیوں کی آگ تو بالکل بجھ چکی ہے۔ لیکن دلوں کے اندر "جو غم کی آگ" بھڑک اٹھی ہے، اس کی طرف کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کو بجھانے کا کسی کو بھی خیال نہیں آتا۔ حالانکہ "یہ آگ" تو نمرود کی آگ سے بھی زیادہ ہولناک اور ہلاکت خیز ہے۔
"اس آگ" کو تو شاید ساری دُنیا کے سارے فائر انجن بھی نہیں بجھا سکتے۔!
کیا اپنے ملک میں کوئی اس آگ کی تپش کو بھی محسوس کر رہا ہے۔ ؟
کیا پتہ — کیا پتہ — اب تو ان لاشوں کو لے جاؤ — اور دوسری لاشوں کے لئے جگہ خالی کر دو۔

ابھی تو اس شہر میں اور بھی بہت سے غریب آباد باقی ہیں یارو۔!
پرانی لاشیں اٹھاؤ۔
نئی لاشوں کے لئے جگہ خالی کرو یارو!

حافظ کا شکستہ جام

(ایرانی زلزلہ)

زمین کا بھوکا تو انسان ہے !

لیکن زمین بھی انسان کی بھوکی نکلی ! ؟

بلکہ زمین تو انسان سے بھی زیادہ بھوکی نکلی ! ! !

انسان کے بارے میں تاریخ گواہ ہے کہ زمین کی لالچ میں اس نے اپنے بے مثال پیار تک کو تباہ کرنے میں کبھی کوئی دریغ نہیں کیا۔ وہ یونان سے لے کر ویت نام تک لاکھوں کروڑوں انسانوں کو موت کے منہ میں جھونکتا چلا آیا ہے۔

صرف زمین کے حصول کے لالچ میں۔

لیکن یہ زمین بھی انسان کی کچھ کم بھوکی نہیں ہے، آئے دن بلکہ روزانہ وہ لاکھوں

انسانوں کو تو ہڑپ کر لیتی ہے لیکن کبھی کبھی اس کی بھوک ایسی چمک اٹھتی ہے کہ وہ آناً فاناً اور چشم زدن میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کو ہڑپ کر جاتی ہے۔

اس بھوکی لالچی اور ظالم زمین نے ہمارے پڑوس ایران میں کوہِ البرز کے دامن میں آباد ہنستے کھیلتے، چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے ہزاروں انسانوں کو ایک ہی نوالے میں ہڑپ کر لیا۔

زندگی کتنی کتنی سال لمبی ہوتی ہے۔

لیکن صرف لمحہ بھر کی موت لمبی سی لمبی زندگی کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔

سرزمین شیراز میں موت نے صرف تین لمحوں تک زلزلہ کا رقص کیا اور ان تین لمحوں میں برسوں لمبی لمبی زندگیوں کا نام و نشان اس زمین پر سے مٹ گیا۔

اب سرزمین شیراز پر بڑی ڈراؤنی خاموشی پھیلی ہوئی ہے، جن چھتوں اور دیواروں کے نیچے زندگیاں موت سے بچنے کے لئے پناہ لیتی تھیں، اب وہ دیواریں اور چھتیں اینٹ اینٹ بکھر گئی ہیں۔

ہر گھر — گور بن گیا ہے۔

ہر طرف اینٹوں، پتھروں کا ملبہ ہی ملبہ نظر آتا ہے، انسان کا گھر کہیں نہیں ہے۔

ان ملبوں میں، ان کھنڈروں میں کوئی بچہ اپنے باپ کا سایۂ عاطفت ڈھونڈ رہا ہے کوئی ماں کبھی زمین کے گڑھے کو دیکھتی ہے اور کبھی اپنی اجڑی گود کے گڑھے کو تکتی ہے اس کھنڈر میں کسی کنواری کی حیا کی چادر کھو گئی ہے اور اس کھنڈر میں کوئی دلھن اپنے

سہاگ کا جھومر ڈھونڈنے آئی ہے۔

ان کھنڈروں میں اب آنسوؤں کے موتیوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ان ملبوں میں یتیمی اور بیوگی کی ہلکی ہلکی جگر کو چیر دینے والی سسکیوں کے سوا، اور کچھ نہیں سنائی دیتا۔

بھو کی لالچی اور ظالم زمین نے سارے ایران میں اب آنسوؤں کے سوائے کچھ بھی تو نہیں چھوڑا ہے۔

زندگی سے لبریز قصہ کہانیوں والا جنوبی ایران اب ایک ویرانہ ہے۔ ایک قبرستان ہے۔

کوہ البرز کی چوٹیاں، حضرت امام رضا کے مزار کے کلس، خلیفہ ہارون الرشید اور نادر شاہ درانی کے مقبروں کے مینار مبہوت اور دم بخود کھنڈر ہی کھنڈر اور لاشیں ہی لاشیں دیکھ رہے ہیں۔

زندگی کے علمبردار امام غزالی اور فردوسی کی قبروں کے ارد گرد چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔

پھولوں اور پھول جیسے چہروں۔ پھلوں اور پھل جیسے لذیذ جسموں، خوشبوؤں اور خوشبوؤں جیسی زلفوں والے حسین و جمیل خراسان کا سارا حسن و جمال زلزلے اور موت کے قزاقوں نے آناً فاناً میں لوٹ لیا ہے۔

اب خوبرو سرزمین شیراز ایک بھیانک اور متعفن لاش کی طرح سڑ رہا ہے۔

مجھے پھولوں اور خوشبوؤں کی اس سرزمین کو دیکھنے کی خوش نصیبی حاصل ہے، ویسے

بھی بہت بچپن سے میں قصہ کہانیوں میں خراسان کا حسن بہت دیکھتا رہا تھا۔

ابومسلم خراسانی اور فردوسی کے اس سُندر دیس میں زندگیوں کے قافلے سونے چاندی کے جگمگاتے لعل وجواہر سے دمکتے، گیتوں اور غزلوں سے گونجتے، شراب اور شباب سے بہکتے زلف اور عطرے سے مہکتے، ساری دُنیا کی نگاہوں کا مرکز بنے رہتے تھے۔

اب وہ سارے قافلے لُٹ چکے ہیں، سرائے اور قہوہ خانے ڈھ چکے ہیں، سارے قصہ خواں اور ساری رقاصاؤں نے دم توڑ دیا ہے۔

وہ فردوسی کی غزل شاہنامہ جاں بہ لب ہے۔

وہ سعدی کی داستان کراہ رہی ہے۔

وہ عمر خیام کی صراحی چھلک گئی ہے۔

وہ حافظ کا پیالہ ٹوٹ گیا ہے۔

انسان زمین کو ماں کہتا ہے۔

ڈائن ماں۔!

اس ڈائن ماں نے بارہا اپنے بیٹوں کو ہڑپ کر لیا ہے۔

۱۵۵۶ء میں شانسی (چین) کے ۸ لاکھ ۳۲ ہزار، ۱۷۳۷ء میں کلکتے کے تین لاکھ، ۱۷۵۵ء میں لزبن پرتگال کے ۶۰ ہزار، ۱۹۰۵ء میں کانگڑہ بھارت کے ۲۰ ہزار، ۱۹۰۶ء میں سان فرانسسکوں کے بے شمار، ۱۹۲۳ء میں ٹوکیوں کے ڈیڑھ لاکھ، ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ کے ہزاروں اور ۱۹۶۰ء میں آغادیر (مراکش) ۱۹۶۸ء میں ازمیر (ترکی) کے لاکھوں انسانوں سے

ے کر اب ارضِ خراساں میں اب تک کوئی پانچ بار ڈیڑھ لاکھ انسانوں کو ہڑپ کر چکی ہے۔

یہ اپنی ہی اولاد کو ہڑپ کر جانے والی ڈائن ماں!

مرنے والوں کو کوئی زندہ نہیں کر سکتا۔ مرنے والے کے غم کو دل سے کبھی نکالا نہیں جا سکتا۔

اور مرنے والے ایک دو ہوں تو کوئی بات بھی ہے، اگر مرنے والے ہزاروں لاکھوں ہوں تو۔۔؟

مرگ انبوہ جشنے دارد۔۔؟؟

ہم کسی ماں کی خالی گود کو بھر نہیں سکتے، کسی بچے کو اس کا کھویا ہوا سایۂ عاطف نہیں دے سکتے ہم کسی کا سہاگ نہیں لوٹا سکتے۔

لیکن ہم رونے والوں کے آنسو تو پونچھ سکتے ہیں۔

ہم برہنگی پر حیا کی چادر تو اوڑھا سکتے ہیں۔

آج خراسان میں زندگی برہنہ اور آبدیدہ ہے۔

یارو آؤ آج خراسان میں زندگی کی برہنگی کو حیا۔ کی چادر سے ڈھانک دیں اور خراسان کی روتی بسورتی زندگی کی آنکھوں سے آنسو تو پونچھ دیں ما